بات سے بات

انور مسعود

طنز و مزاح

انور مسعود

دیکھتا چلا گیا

’’آنکھیں بڑی نعامت ہیں بابا‘‘

سماعت کی توفیق نہ ہوتی تو اندھے گداگر کا یہ جملہ بھی کیسے سن پاتے؟ ثابت ہوا کہ کان بھی بڑی نعامت ہیں بابا۔۔۔۔۔۔
اور اس طرح نعمتوں کا شمار کرتے جایئے تو ہندسے بھی ختم ہو جائیں۔

لیکن ان نعمتوں کو بسا اوقات بڑی کٹھن آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ کچھ سننا پڑتا ہے جو آدمی سننا نہیں چاہتا۔ وہ کچھ دیکھنا پڑتا ہے جس کے نہ دیکھنے کی خواہش ہوتی ہے۔ دل سے ایسے خیال گزرنے لگتے ہیں کہ بس خدا کی پناہ!

اس وقت مجھے آنکھوں کی کچھ ایسی ہی آزمائشوں کا قصہ بیان کرنا ہے جن کا ابھی ابھی ذکر ہوا ہے۔ یہ چند باتیں عام مشاہداتی حافظے پر ہلکی سی دستک کی حیثیت رکھتی ہیں اور غزل کی زبان میں اس تحریر کو ’’تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو‘‘ بھی کہا جا سکتا ہے۔

ہاں تو عرض یہ ہے کہ میں نے ایک پنواڑی کی دکان پر دیکھا کہ اس کے لائٹر کے ساتھ رسی بندھی ہوئی ہے جس کا دائرہ کار بڑا مختصر رکھا گیا ہے۔ اس دکان پر کھڑے ہوئے ایک غیر ملکی نے بڑی حیرت سے مجھ سے یہ سوال کیا۔ ’’اس لائٹر کے ساتھ یہ رسی کیوں بندھی ہوئی ہے؟‘‘

یہ سوال میرے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی اور دوسری باتوں میں الجھانا چاہا لیکن میرے اس گریز آمیز رویے سے اس کا تجسس اور بھڑک گیا اور اس نے پھر وہی سوال دہرا دیا۔

بہر حال اتنے عرصے میں میں اپنی دفاعی حیثیت مضبوط کر چکا تھا۔ میں نے فوراً پوری تفصیل سے جواب دیا۔

’’محترم! یہ رسی اس لیے باندھی گئی ہے کہ ضرورت کے وقت لائٹر فوری طور پر دستیاب ہو جائے' ڈھونڈنے میں وقت نہ ہو' گاہکوں کو پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وقت ضائع نہ ہو۔‘‘ وقت کے ضائع ہونے پر میں نے خاص طور پر زور دیا اس لیے کہ وقت کا بیش قیمت ہونا ایک عالمگیر سچائی ہے۔

میرے اس جواب پر وہ شخص مطمئن ہو گیا لیکن میرے دل میں ایک عجیب چبھن چھوڑ گیا۔ مجھ پر اس حساس لمحے میں انکشاف ہوا کہ سب سے زیادہ مشکل کام تو اپنے آپ کو مطمئن کرنا ہے۔

احساس کے بدن پر اس خراش کی دھن لے کر میں آگے بڑھ گیا۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ بازار میں ایک دکان کے پاس ٹھنڈے پانی کی ایک سبیل لگی ہوئی ہے جس سے تشنہ لب راہرو اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ اس شدید گرمی کے موسم میں یہ کار خیر۔۔۔۔۔۔۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے احساس کا مسافر تپتے ہوئے صحرا سے نکل کر نخلستان میں آ گیا ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر میں مسرور ہونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک میری نظر سبیل کے پاس پڑے ہوئے ایلومینیم کے اس گلاس پر پڑی جس کے سرے پر سوراخ کر کے اس میں زنجیر ڈال دی گئی تھی۔

''اس گلاس میں لوہے کی زنجیر کیوں ڈال دی گئی ہے؟''

کسی نے میرے کان سے منہ لگا کر بڑے زور سے یہ سوال پوچھا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ گوش خراش آواز اسی اجنبی کی ہو گی جو کچھ دیر پہلے مجھے پنواڑی کی دکان پر ملا تھا۔ میں نے فوراً اپنے ارد گرد دیکھا لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ میں خود اپنے آپ سے مخاطب تھا۔ اجنبی جا چکا تھا لیکن میرے ساتھ ساتھ تھا۔ پانی پیئے بغیر میری پیاس بجھ گئی اور زبان کے کانٹے دل میں چبھنے لگے۔

میں اور آگے بڑھ گیا اور پھر ایک جنرل مرچنٹ کی دکان کے پاس اچانک رک گیا۔ راستہ مسدود تھا۔ گھی کے بہت سے ڈبے قطار اندر قطار' مثلثی ترتیب کے ساتھ ایک پہاڑی کی صورت میں میرے سامنے تھے اور ہر ڈبے کا کنڈا ایک آہنی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ میں ٹھٹک گیا۔ یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟ گلاس کی زنجیر اتنی لمبی کیسے ہو گئی۔ چیزوں کو زنجیر ڈالنے کی یہ کیا رسم پڑ گئی ہے؟ اجنبی نے میرا سوال بدل کر مجھے لوٹا دیا۔

''یہ نہ پوچھو کہ یہ کیا رسم پڑ گئی ہے' یہ بتاؤ کہ رسم کیوں پڑ گئی ہے؟''

میں اس ''کیوں'' کی خاردار جھاڑی سے نکلنے میں مصروف تھا کہ اجنبی مجھے گلستان کی ایک حکایت سنانے لگا جس میں ایک بستی کا ذکر تھا جس کے باسیوں میں ایک عجیب عادت رواج پا گئی تھی کہ وہ ہر باندھنے والی چیز کو کھلا چھوڑ دیتے تھے اور کھلی چھوڑنے والی چیز کو باندھ دیتے تھے۔ اجنبی نے سعدی کا حوالہ دیا تھا' میں نے غالب کا سہارا لیا۔

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اور پھر میں دیر تک بھاگتا رہا' یہاں تک کہ شام ہو گئی اور اتفاق ایسا ہوا کہ میں ایک ایسی جگہ جا رکا تھا جہاں بہت سی ریڑھیاں کھڑی تھیں' محنت کشوں کی ریڑھیاں' مزدوروں کی ریڑھیاں' یا بہ زنجیر ریڑھیاں' میں اس زنجیر در زنجیر منظر سے نظر ہٹا کر اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ دیوار کے ساتھ ایک مدھم سا بلب جل رہا تھا جس کے ارد گرد لوہے کی ایک جالی تھی اور بلب کے اس آہنی قفس کے

ساتھ ایک ننھا سا تالا لٹک رہا تھا۔ میں سوچنے لگا۔ تالے کی شکل سوالیہ نشان سے کتنی ملتی جلتی ہے۔

یہ چھوٹا سا تالا میرے لیے سب سے بڑی علامت استفہام بن گیا۔ اجنبی مجھے مشاہدے کے کس کرب میں مبتلا کر گیا ہے۔ وہ لائٹر کی رسی سے اتنا ڈرا گیا ہے کہ اب مجھے ہر کہیں یہی رسی دکھائی دیتی ہے۔ میں اس کی مختلف صورتیں دیکھ کر چونک پڑتا ہوں۔ بنیان کے اندر لگی ہوئی جیب بھی اسی کی ایک صورت ہے۔ رات بھر چوکیدار کی گرجدار "ہوشیار باش" میں بھی یہی رسی لہراتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولے گا جب میں نے ایک مسجد کے صحن میں دیوار پر یہ عبارت لکھی ہوئی دیکھی۔۔۔۔۔۔

"اپنے جوتے کی یہاں آپ حفاظت کیجئے"

میں مسجد سے باہر نکلا تو اندھا فقیر صدا دے رہا تھا۔

"آنکھیں بڑی نعامت ہے بابا"

ایک مشاعرہ ناروے کا

دنیا جتنی سمٹتی جا رہی ہے مشاعروں کا دائرہ اتنا ہی پھیلتا جا رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ایک محلے کے کچھ شاعر اکٹھے ہو کر ایک محفل سخن سجا لیتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ کسی ایک شہر کے سارے سخن ور جمع ہو کر ایک بڑا مشاعرہ برپا کر لیتے تھے اور پھر ہم نے دیکھا کہ ملکی سطح کے مشاعرے ہونے لگے اور شعر خوانی کی پاکستان گیر محفلیں جمنے لگیں۔ یہ سب محفلیں بھی اپنی اپنی سطح پر زندہ اور قائم ہیں اور اب ماشاءاللہ عالمگیر اور بین الاقوامی مشاعرے منعقد ہونے لگے ہیں۔ پہلے صرف سنجیدہ مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ ان مشاعروں میں کوئی مزاح نگار شاعر بھی اپنا رنگ جما لیا کرتا تھا لیکن اب تو بین الاقوامی سطح پر باقاعدہ مزاحیہ مشاعروں کا اہتمام ہونے لگا ہے۔

اس اعتبار سے اردو زبان دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے کہ مشاعروں کے حوالے سے اسے عالمگیر پذیرائی نصیب ہے۔ برصغیر کی یہ ثقافتی روایت خلیج کی ریاستوں سے لے کر امریکہ کی ریاستوں اور یورپی ممالک تک پھیل چکی ہے۔ نیویارک' لندن' واشنگٹن' دلی' لاہور' کراچی' ٹورنٹو' اوسلو' ابوظہبی' دوبئی اور جدہ میں بھی بین الاقوامی مشاعرے ہونے لگے ہیں۔ پچھلے دنوں چین کے اردو شاعر انتخاب عالم پاکستان آئے ہوئے تھے۔ وہ جس مشاعرے میں بھی شریک ہوئے وہ ایک دم بین الاقوامی ہو گیا۔

سائنس کی عطا کردہ تیز رفتاری شعر و ادب کی کتنی ممد و معاون ثابت ہو رہی ہے' کچھ بعید نہیں کہ مستقبل قریب میں ایک روز فلک عطارد کے اخباروں میں ایسی خبر شائع ہو جائے کہ "ہمارے سیارے کے فلاں شہر میں' ہمارے کیلنڈر کے مطابق فلاں تاریخ اور ہمارے وقت کے مطابق اتنے بجے ایک کائناتی اور بین السیاراتی مشاعرے منعقد ہو رہا ہے جس میں مشتری سے فلاں شاعرہ' فلک زحل سے فلاں سخنور اور مریخ سے فلاں شاعر شیوا بیان شرکت فرمائیں گے۔ کرۂ ارض کے نامور مزاح نگار سید ضمیر جعفری مہمان خصوصی ہوں گے۔ جبکہ اسی سیارے کے عظیم شاعر جناب احمد ندیم قاسمی مشاعرے کی صدارت فرمائیں گے اور نظامت کے فرائض فلک قمر کے فلاں شاعر انجام دیں گے۔"

سائنس کی معاونت سے اب تو ہر مشاعرہ ویڈیو اور آڈیو کیسٹوں پر بھی محفوظ ہو رہا ہے۔ سائنس نہ صرف ادب و شعر کی معاون ہے بلکہ مذہبی عقائد کی صداقت کے ثبوت بھی فراہم کرتی جا رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص روز حشر وصول ہونے والی' فرشتوں کی تیار کردہ' اس کیسٹ کا منکر ہے جسے نامہ اعمال کہا گیا ہے تو اسے تمغۂ جہالت کے سوا اور کیا ایوارڈ دیا جا سکتا ہے؟

ویڈیو سے یاد آیا کہ اب تو وہی شادی منفرد ہے جس کی ویڈیو نہ بنائی جائے۔ وہی مسافر انوکھا مسافر ہے جو سفرنامہ نہ لکھے اور وہی مشاعرہ عجیب مشاعرہ ہے جو بین الاقوامی نہ ہو۔

ان مشاعروں کا یہ پہلو انتہائی تابناک ہے کہ پاکستان اور ہندوستان کے غریب الوطن اس بہانے اپنے اپنے وطن سے رابطہ قائم رکھے ہوئے ہیں اور شعر کے آئینے میں دور بیٹھے ہوئے بھی وطن کی صورت احوال دیکھتے رہتے ہیں اس لیے کہ یہ مشاعرے زیادہ تر ان لوگوں کی ادبی انجمنوں کے زیر اہتمام منعقد کیے جاتے ہیں جنہیں ہندوستان اور پاکستان سے تلاش رزق کے سلسلے میں اجنبی دیاروں کا سفر درپیش ہے۔

اس ضمن میں ایک تکلیف دہ بات کا ذکر بھی بے محل نہیں کہ ہمارے علمائے دین ان دیاروں میں بھی اپنے تعصبات ساتھ لے کر گئے ہیں اور ان تعصبات میں اتنی شدت ہے جو بسا اوقات تشدد کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ اقبال نے حضرت ملا کے بارے میں کتنا درست کہا تھا کہ

خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لب کشت

اس لیے کہ

بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت

صد حیف کہ واعظ اپنا منہ اس طرح کھولے کہ مسجد کے دروازے پر تالا پڑ جائے۔

اسی طرح انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مشاعروں کا اہتمام کرنے والی مختلف ادبی انجمنوں کے درمیان بھی طرح طرح کے اختلافات دیکھنے اور سننے میں آ رہے ہیں۔ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔

ہمارے ملک کے نامور شاعر جناب منیر نیازی کو ناروے سے مشاعرے کی دعوت موصول ہوئی انہوں نے اپنی بیگم سے اس Invitation کا تذکرہ کیا۔ دوسرے روز بیگم صاحبہ نے نیازی صاحب سے پوچھا کہ "آپ ناروال کب جا رہے ہیں؟" بلاشبہ یہ لطیفہ نوح ناروی صاحب کو ناروے کا باشندہ سمجھنے سے بڑھ کر ہے۔ ہمارے ایک شاعر دوست ایک دن غیر معمولی مسرور دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے اس مسرت کی وجہ دریافت کی تو کہنے لگے کہ آج میری بیگم نے زبردست بات کی ہے۔ اس نے ایک سیاہ رنگت کی عورت کو دیکھا اور اس کی جلد کی سیاہی کو اس طرح بیان کیا کہ "وہ اتنی کالی تھی کہ اندھیرے میں بھی صاف دکھائی دیتی تھی۔" یعنی تاریکی سے بڑھ کر تاریک تھی۔ میں بھی اس رنگ بیان کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

اصل میں مجھے اس مضمون میں ''ناروول'' یعنی ناروے کے صدر مقام اوسلو میں منعقد ہونے والے ایک بین الاقوامی مشاعرے کا ذکر کرنا ہے جس کا اہتمام ہمارے پاکستان بھائی اور ادب دوست شخصیت سید مجاہد علی نے کیا تھا۔ وہاں کے اردو ماہنامے انٹرنیشنلسٹ کے مدیر محمد رفیع' محمد طارق اور مبارک احمدان کے معاونین تھے۔ محمد رفیع صاحب نے انٹرنیشنلسٹ کے تازہ ترین شمارے میں (جو مشاعرے کے انعقاد سے قبل شائع ہوا تھا) منیر نیازی صاحب کے اور میرے بہت سے اشعار بڑے اہتمام سے شائع کئے تھے۔ پرچے کا وہ شمارہ بہت عمدہ تحریری استقبالیہ محسوس ہوا۔

اس بین الاقوامی مشاعرے میں لنڈن سے افتخار عارف' جرمنی سے رخسانہ شمیم' نیویارک سے صبیحہ صبا اور پاکستان سے مجھے اور منیر نیازی کو مدعو کیا گیا تھا۔ نظامت کے فرائض افتخار عارف صاحب نے اپنے مخصوص اور انتہائی خوبصورت انداز میں انجام دیئے۔ یہ مشاعرہ اوسلو کے ملٹی کلچرا یکٹویٹی سنٹر (Multiculture Activity Centre) کے اوسلو کنسرٹ ہاؤس میں منعقد کیا گیا۔ مشاعرے کے صدر جناب منیر نیازی تھے وہ اپنی صدارت کے دوران بھی بعض ناگزیر احتیاجات کے باعث بار بار کرسی صدارت سے علیحدگی اور اوسلو کے عظیم House Concert کے کسی ملحقہ کمرے میں تنہائی اختیار کر لیتے تھے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔صدر ہر جا کہ نشیند صدر است

اس مشاعرے سے کچھ عرصہ پہلے اوسلو میں اسلم کمال کی خطاطی کی نمائش ہو چکی تھی۔ اپنی مصورانہ خطاطی میں اسلم کمال نے علامہ اقبال کو کس طرح Paint کیا ہے اس پر ناروے کی ایک خاتون کا تبصرہ شنیدنی ہے۔

''ایسا لگتا ہے کہ یہ شخص (علامہ اقبال) اپنے لوگوں کو اندھیرے سے نکال کر اجالے کی طرف لے جانا چاہتا ہے۔''

بلاشبہ یہ جملہ علامہ اقبال کی تعلیمات اور اسلم کمال کی کامیاب مصوری پر نہایت جامع تبصرہ ہے۔

اوسلو کے اس مشاعرے کے پہلے دور میں ناروے کے شعراء نے ناروے کی زبان Norvegian میں اپنا کلام سنایا۔ ایک پاکستانی نوجوان نے بھی اس زبان میں ایک خوبصورت نظم سنائی۔ اس نوجوان شاعر نے تقریباً بیس بائیس سال ناروے کی فضا میں گزارے ہیں اور اب وہ بالکل نارویجن ہو کر رہ گیا ہے۔

ہمارے لیے یہ زبان کاملاً اجنبی تھی لیکن کوئی کوئی لفظ پنجابی کے کسی لفظ سے صوتی اعتبار سے بہت قریب لگتا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس زبان کے بعض الفاظ پنجابی کے بعض الفاظ کے ہم صوت ہی نہیں بلکہ ہم معنی بھی ہیں اور گرامر میں بھی بعض چیزیں مشترک ہیں۔ زبان شناسوں کے لیے ان زبانوں کا ہم رشتہ ہونا بڑا دلچسپ موضوع ہے۔ پروفیسر شریف کنجاہی صاحب جب ناروے گئے تو

اس لسانی تشابہ نے ان کے ذوق تحقیق کو اتنا مہمیز کیا کہ انہوں نے پنجابی اور نارویجن کے تقابلی مطالعے پر ایک نہایت ہی تحقیقی اور تفصیلی مطالعہ تحریر کر دیا ہے۔

منیر نیازی پر بعض اوقات لطیفے سنانے کا زبردست موڈ طاری ہوتا ہے۔لطیفہ سناتے ہوئے وہ لطیفے کی فضا میں اتنا ڈوب جاتا ہے کہ سننے والوں کو بھی لے ڈوبتا ہے۔اس موقع پر اگر وہ کھانا کھا رہا ہو تو اس کا منہ لقمے کا اور اس کا سگریٹ کش کا انتظار کرتا رہ جاتا ہے۔ سننے والوں کو بھی لامحالہ سست خوری کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے۔منیر نیازی کھانا کھاتے ہوئے پانی کم اور سگریٹ زیادہ پیتا ہے۔

ایک ایسے ہی موقع پر اس نے یہ لطیفہ سنایا کہ ایک ہال میں ایک میوزیکل کنسرٹ ہو رہا تھا۔موسیقی کی یہ محفل پورے عروج پر تھی کہ اچانک ایک پلہ ہال میں گھس آیا اور آ کر پیانو بجانے لگا۔پیانو کو اس نے اتنی مہارت سے بجایا کہ سامعین پر ایک سحر طاری ہو گیا۔اتنے میں ایک سڑیل اور خوفناک کتیا ہال میں داخل ہوئی اور اس نے بڑے غصے سے پلے کو دبوچ کر ہال سے باہر پھینک دیا۔ معلوم ہوا کہ یہ اس کی ماں تھی اور اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھی۔

دسمبر اپنے نصف کو الوداع کہہ رہا تھا۔اوسلو میں سردی اور برف باری کی اوج پر تھی۔اس کے ساتھ ہی کرسمس کی تیاریاں بھی پورے عروج پر تھیں۔منیر نیازی نے کہا۔"انور مسعود! ہم ان لوگوں کی خوشیوں کے موسم میں یہاں آئے ہیں۔" اور پھر کہا۔"رب کریم تریا شکرا اے۔"

ہمارے پاکستانی دوستوں نے بتایا کہ جوں جوں قطب شمالی کے قریب ہوتے جائیں' عجیب عجیب مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ اوسلو سے دو ہزار میل شمال کی جانب لوگ ۲۴ جون کی رات کو سمندر کے کنارے آگ کے الاؤ روشن کرتے ہیں اور آدھی رات کے وقت سورج کے طلوع ہونے کا نظارہ کرتے ہیں۔طلوع آفتاب کے اس حیرت انگیز منظر کو Midnight Sun کہا جاتا ہے۔یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض اوقات اوسلو کے آسمان پر کئی رنگوں کی عجیب قسم کی طلسماتی روشنیاں دوڑنے لگتی ہیں۔رنگ ونور کا یہ متحرک منظر ایسا جادو اثر ہوتا ہے کہ ناظر کے لیے پلک جھپکنا دشوار ہو جاتا ہے۔بھاگتی پھرتی ہوئی یہ رنگ بھری روشنیاں پھر اچانک غائب ہو جاتی ہیں۔ابھی تک یہ دریافت نہیں ہو سکا کہ یہ روشنیاں کہاں سے آتی ہیں اور دیکھنے والوں کو حیران کر کے کدھر چلی جاتی ہیں۔یہ منظر ایسا خوش رنگ ہوتا ہے کہ قوس قزح بھی دیکھتی رہ جائے۔

مشاعرہ گاہ کی طرف جاتے ہوئے ہر چیز ٹھہری ٹھہری اور ٹھٹھری سی لگتی تھی۔ایسا لگتا تھا کہ پورے شہر نے برف کی بغل مار رکھی ہے۔پیڑوں کی شاخیں اور پتے بھی سفید ہو گئے تھے۔فضا اتنی یخ بستہ اور اتنی جمیل تھی کہ نگاہیں منظروں کے ساتھ جم کر رہ گئی تھیں۔

گلوں کی جھولیوں میں برف ہی برف تھی۔گلاب کے پھول کپاس کے پھول بن گئے تھے۔

کہیں کہیں راستے میں بڑے بڑے چوراہوں پر کچھ بورڈ دکھائی دیتے تھے جن پر عورتوں کی بڑی بڑی عریاں تصاویر دکھائی دیتی تھیں۔مشاعرے کے منتظم سید مجاہد علی نے بتایا کہ اب حکومت یہ فیصلہ کر چکی ہے کہ ان تصویروں کو اتار دیا جائے' یعنی انہیں اتار دیا جائے جنہوں نے لباس اتار رکھا ہے اس لیے کہ ڈرائیور حضرات بڑے ڈسٹرب ہوتے ہیں اور حادثہ ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ چلو اہل مغرب کو یہ احساس تو ہوا کہ عریانی خطرے کا باعث ہے۔

باہر مسلسل برف باری ہو رہی تھی اور اوسلو کے عظیم ملٹی کلچرل ایکٹویٹی سنٹر میں ایک ہی وقت میں کئی تقریبات منعقد ہو رہی تھیں جن میں سے ایک یہ مشاعرہ بھی تھا جس میں تین زبانوں (ناریجن' اردو اور پنجابی) کے اشعار پڑھے گئے۔

اوسلو کے اس مشاعرے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ ناروے کے چند ایک باشندوں کے سوا اس کے سامعین بھی پاکستانی تھے اور وہ بھی زیادہ تر پنجابی اور پنجابی بھی زیادہ تر ضلع گجرات کے رہنے والے ۔۔۔۔۔۔لہذا میری پنجابی نظموں کے لیے فضا بہت ہی سازگار تھی۔

مشاعرے کے سامعین کے حسن ذوق کی داد نہ دینا بڑی ناانصافی ہوگی۔انہوں نے افتخار عارف' صبیحہ صبا' رخسانہ شمیم آذر اوسلو کے مقیم پاکستانی شعراء کا کلام بھرپور داد اور بھرپور توجہ کے ساتھ سنا۔افتخار عارف کے شعری ذوق' حسن بیان اور معلومات عامہ کا ایک زمانہ قائل ہی نہیں گھائل بھی ہے۔ان کا انداز گفتگو اور شیوہ شعر خوانی ایک انفرادیت کا حامل ہے وہ شعراء کو اس طرح متعارف کراتے رہے کہ سامعین کے اشتیاق کا گراف اونچا ہی اونچا ہوتا چلا گیا۔مجھے انہوں نے آخر میں اور صاحب صدر (منیر نیازی) سے پہلے شعر سنانے کی دعوت دی۔

اللہ کا فضل میرے شامل حال رہا۔ میرے اردو قطعات اور پنجابی نظموں (اج کیہ پکایئے ۔۔۔۔۔۔لسی تے چاء ۔۔۔۔۔۔نارکلی دی مجھ) کو اوسلو کے گجراتیوں نے ایسی داد سے نوازا کہ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں پنجاب کے کسی شہر میں اپنی یہ نظمیں پہلی بار سنا رہا ہوں۔قہقہوں کی موسلادھار بارش میں سامعین جب لوٹ پوٹ ہو رہے تھے تو میں نے یہ دیکھا کہ ناروے کے باشندے اپنے قریبی پاکستانیوں سے پوچھ رہے تھے کہ یہ شخص کیا بات کر رہا ہے۔پاکستان حضرات ان کو کچھ ترجمہ کر کے بتاتے تو ان کے چہروں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی۔ناروے کے سامعین کے تاثر کا صحیح اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب مشاعرہ اختتام کو پہنچا تو ایک معمر گیٹ کیپر خاتون میرے پاس آ کر بڑی عقیدت کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔اس کو انگریزی زبان نہیں آتی تھی اور میں نارویجن سے

نابلد۔۔۔۔۔۔اس کے ہونٹوں پر ایسی داد تھی جو اظہار کو ترستی تھی۔اس کی آنکھوں میں مسرت اور تحسین سے بھرپور ایسی چمک تھی جو میں زندگی بھر فراموش نہیں کر سکتا۔مجھے اللہ کے کرم سے مشاعروں میں بڑی بڑی داد نصیب ہوئی ہے لیکن اس خاتون کی خاموش داد مجھے ہر بولتی ہوئی داد سے بڑھ کر محسوس ہوئی۔ایسا گونجتا ہوا سناٹا میں نے بہت کم سنا ہے۔خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

منیر نیازی Dialogue کا بہت رسیا ہے لیکن مشاعرے میں کلام سنانے کے سلسلے میں بہت کم گو۔دو تین شعر سنانے کے بعد وہ کچھا کتا جاتا ہے اور اسٹیج کو الوداع کہہ دیتا ہے۔لیکن سامعین کے پیہم اصرار پر اس نے سامعین سے اپنے اردو اور پنجابی کلام کو زیادہ بچا بچا کے نہیں رکھا اور خلاف عادت جی بھر کے سنایا لیکن منیر جتنا بھی سنئے ایک تشنگی تو رہ جاتی ہے۔منیر کی غزل کے جمال میں ایک عجیب شان گریز ہے۔ذہن اس کے شعر کے تعاقب میں اس طرح بھاگتا ہے جیسے تتلی کا پیچھا کرتا ہوا بچہ۔

مشاعرے کے اختتام پر شعراء کا گروپ فوٹو بنایا جانے لگا تو منیر نیازی نے فوٹو گرافر سے کہا۔

''اوئے کا کائے قلت (منیر کا عمومی کلمہ تخاطب) ذرا ٹھہر جا' تصویر کھنچوانے سے پہلے میں ذرا خوشبو تو لگا لوں۔''

ناروے شمالی یورپ کی ایک فلاحی مملکت اور دیگر فلاحی ملکوں کی طرح وہاں کی یہ بات بہت ہی قابل ذکر ہے کہ وہاں پر انسانی احترام بہت زیادہ ہے اور انسانوں میں امتیاز بہت کم۔یہاں تک کہ بڑے سے بڑا عہدہ بھی وجہ تفریق نہیں۔قانون کی بالادستی ہے۔نظام عدل کسی منصب جلیلہ کی کوئی رعایت نہیں کرتا۔ایک دفعہ ایک خاتون وزیر کا ۳۵ روپے کا ذاتی بل غلطی سے ایک سرکاری بل کے ساتھ چلا گیا تو آڈٹ ہونے پر وزیر کو مستعفی ہونا پڑا۔وزراء کے لیے کوئی پروٹوکول نہیں ہے۔سرکاری کار اور سرکاری رہائش بھی میسر نہیں۔وہ عام انسانوں کی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں۔کسی مقام سے گزرتے ہیں تو کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔سنا ہے کہ پارلیمنٹ کے اجلاس میں بیٹھی ہوئی ایک وزیر اعظم کو اجلاس کے دوران میں یہ پریشانی لاحق تھی کہ وہ چولہا جلتا ہوا چھوڑ آئی ہے' کہیں اس کی ہانڈی جل نہ گئی ہو۔کسی قسم کا بھی کام کرنے میں کسی کو کوئی عار نہیں ہے۔ممکن ہے وہاں پر کوئی خاتون کسی ہوٹل میں جمعدارنی کا کام کرتی ہو' اس کے پاس اپنی کار بھی ہو اور اس کے ساتھ ہی وہ یونیورسٹی میں فلسفے کی طالبہ بھی ہو۔

ناروے کے اس حسین ملک میں منیر نیازی کے ساتھ کئی دن مسلسل اٹھنے بیٹھنے اور اسے بہت قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔وہ ہر کسی سے کھلتا بھی نہیں۔وہ کہتا ہے کہ جو میرے نزدیک آنا چاہے میں اس کا امتحان لیا کرتا ہوں منظر دیدنی نہ ہو تو وہ اپنی ایک نگاہ بھی ضائع کرنے کا روادار نہیں۔جب وہ کسی کی بات سننے کے موڈ میں نہ ہو تو وقفہ بہ وقفہ کہتا جائے گا۔''بالکل ٹھیک ہے۔'' یہ جملہ دراصل

اس کی عدم توجہ کا اعلان اور تغافل کا اظہار ہوتا ہے۔ اکتا جانا اس کی عادت ہے وہ شہروں سے بھی اکتا جاتا ہے' آدمیوں سے بھی اور لفظوں سے بھی۔ جب ''بالکل ٹھیک ہے'' سے اکتا جاتا ہے تو مخاطب کی ہر بات پر ''ظاہر ہے'' کہنے لگتا ہے۔ یہ جملہ اس کے اظہار بیزاری کا دوسرا پیرایہ ہے۔

ان صحبتوں میں معلوم ہوا کہ منیر کی شخصیت کی کئی پرتیں ہیں۔ کبھی کبھی اس کے اندر سے ایک بہت ہی معصوم سا بچہ باہر نکل آتا ہے اور بچوں کی سی خواہشوں کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ ناروے کے بادشاہ کا مجسمہ (جس میں ایک کتا بھی اس کے ساتھ دکھایا ہے) دیکھ کر وہ بے اختیار ہو کر کہنے لگا۔ ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس ملک کا بادشاہ بن جاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''منیر صاحب! یہاں کا بادشاہ بننے کے لیے آپ کو دو چار کتے بھی رکھنے پڑیں گے۔''

منیر نے فوراً کہا ''ہاں' انور مسعود۔۔۔۔۔۔۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں''

اس کے بعد منیر کے خیالات کا زود پرواز پرندہ کسی اور شاخ پر جھولنے لگا۔ ناروے کی ایک شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے ایک انتہائی پرفضا مقام پر ایک خوبصورت کٹیا دکھائی دی تو منیر نے فوراً کہا۔ ''میرا خیال ہے یہ کاٹیج خرید لوں۔''

میں نے کہا۔ ''مشتری ہوشیار باش' اس منصوبے پر بہت رقم اٹھے گی۔''

یہ بات سن کر بچہ ٹھٹک کر واپس منیر کے اندر چلا گیا اور پھر دیر تک نہیں بولا۔

اس کے بعد یہ دیکھا کہ منیر سراپا دعا بنا ہوا تھا۔ ''رب کریم! محمد ﷺ کے وسیلے سے مجھ پر رحم فرما۔''

منیر نیازی ایک مرتبہ داتا صاحب کے مزار پر حاضری دینے گئے تو سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر یہ دعائیہ الفاظ کہہ کر پلٹ آئے۔

''رب کریم۔۔۔۔۔۔۔ محمد ﷺ دے صدقے میرے تے وی رحم فرما تو علی ہجویری تے وی۔''

بسا اوقات یہ احساس ہوتا ہے کہ منیر نیازی انتہائی خودمست ہے۔ وہ ایک ایسا صیاد ہے جو اپنے دام میں گرفتار ہے۔ ایک نرگسیت کے ہالے نے اسے اپنے گھیرے میں لے رکھا ہے۔ اپنے بارے میں باتیں کرنا اسے بہت مرغوب ہے۔ ایک موقع پر کہنے لگے۔

''میں اپنے شعر اپنے آپ کو سنا کر خود ہی اپنی پیٹھ ٹھونک لیتا ہوں۔''

میرے ایک سوال کے جواب میں جب اس نے کہا کہ ''مجید امجد کے بارے میں کوئی بات کہنے کو ہے ہی نہیں۔'' تو مجھے سخت دھچکا لگا اس لیے کہ میں مجید امجد کے مجموعہ کلام ''شب رفتہ'' کو اس دور کا شعری صحیفہ سمجھتا ہوں۔ اتنے بڑے شاعر کی عظمت کو منیر نیازی

کا Skip Over کر جانا اس کی غیر معتدل خود پسندی کے سوا اور کیا ہے؟

اپنی زندگی کے واقعات بیان کرتے ہوئے منیر نیازی نے کہا۔ ''میں ایک کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں' کھاتا کم ہوں اور پیتا زیادہ ہوں۔ تقسیم ہند سے قبل نیوی میں بھرتی ہو گیا تھا۔ میری والدہ نے مجھے لکھا کہ انگریز کی فوج میں بھرتی ہو کر آدمی شہید نہیں ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔لہٰذا وہاں سے بھاگ گیا۔''

منیر نیازی کی باتوں کا رسیا ہے۔ خوبصورت ڈائیلاگ اس کا مشغلہ ہے۔ اس کی باتیں عام ڈگر سے بہت ہٹی ہوئی ہوتی ہیں وہ بات بات پر چونکا دیتا ہے۔ ایک موقع پر کہنے لگا۔

''جہاں خالص شراب نہ ملے اس ملک پر عذاب الٰہی کیوں نہ نازل ہو؟''

ایک شخص نے منیر سے کہا کہ ''شراب پینے سے میرے بدن پر دھاپڑ پڑ جاتے ہیں۔'' منیر نے اسے جھٹ جواب دیا کہ ''شراب کو معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کون پی رہا ہے جیسے عورت فوراً جان لیتی ہے کہ کون مجھے کس نظر سے دیکھ رہا ہے۔ مجھے جب سندر بن کی سیر کا موقع ملا تو سندر بن کر فوراً معلوم ہو گیا کہ مجھے کون دیکھ رہا ہے؟''

منیر نیازی کی شخصیت کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ وہ حسن کا شیدائی ہے۔ اس کی نزاکت کا عالم یہ ہے کہ کہ اخبار کے ورق پلٹنے سے اسے سردی محسوس ہونے لگتی ہے۔ اس کی نازک مزاجی کسی بدصورتی کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بدصورتی سے وہ اتنا الرجک ہے کہ جس شخص کو ناپسند کرتا ہو اسے کہہ دیتا ہے کہ

''میں دس فٹ لمبے چمٹے سے بھی تمہیں چھونا پسند نہیں کرتا۔''

منیر کو Crime Films دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ بری بات بھی اس کے نزدیک بڑا سنگین جرم ہے۔ جب کسی کی بری بات پر برہم ہوتا ہے تو اسے یہ دھمکی دیتا ہے کہ

''میں تیرا سر تن سے جدا کر کے فٹ بال ٹیم کے حوالے کر دوں گا۔''

ایک شخص نے منیر کے سامنے ایک ایسا شعر پڑھا جو اس کے معیار حسن پر پورا نہیں اترتا تھا۔ منیر فوراً بھڑک اٹھا اور اس سے یوں مخاطب ہوا۔ ''تم برے شعروں میں بری طرح پھنس گئے ہو۔ تمہیں کسی جنگل میں چڑیل نے پکڑ لیا ہے۔''

منیر کی یہ بات ایسے مقولے کا درجہ رکھتی ہے جو آب زر سے لکھنے کے لائق ہے کہ

''اچھی چیزیں دل میں اتنی داخل کرو کہ بری چیزیں بھاگ جائیں۔''

منیر نے فنی نصب العین کے تعین کے سلسلے میں ایک بہت ہی کار آمد بات کی کہ

"اتنے Real نہ ہو جاؤ کہ Unreal لگنے لگو۔"

قرآن مجید کے بارے میں بات کرتے ہوئے منیر نے کہا۔

"قرآن کی آیتوں میں اتنا حسن ہے کہ بے ضمیر انسان سے پردہ کر لیتی ہیں۔" منیر اپنے ہم زمان کسی شاعر کی عظمت کو تسلیم کرنے میں بڑے تامل کا شکار ہے۔ البتہ شعرائے سلف میں بعض شعراء کی عظمت کو بڑے تقدس اور احترام کے ساتھ سلام کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ

"میر درد اور سراج اورنگ آبادی شہید ہیں انہیں مردہ نہ کہو۔ اس دور کے کئی شاعر مردہ ہیں انہیں زندہ نہ کہو۔"

مرزا غالب اور مرزا عبدالقادر بیدل کا موازنہ کرتے ہوئے منیر کہنے لگے۔ "غالب بیدل کا بغل بچہ دکھائی دیتا ہے۔" اس پر مجھے علامہ اقبال کی بات یاد آئی۔ علامہ صاحب نے کہا تھا کہ "غالب بیدل کو نہیں سمجھ سکا۔"

منیر کا کہنا ہے کہ میں صرف ایک شعر سے شاعر کا باطن اور اس کی Range دیکھ لیتا ہوں۔ سراج کا یہ شعر اس کے باطن کی پہنائیوں کی گواہی دیتا ہے۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ وہ میں رہا، نہ وہ تو رہا جو رہی سو بے خبری رہی

منیر نیازی نے بیان کیا کہ "کئی شعر ایک عرصہ تک مجھے Haunt کرتے رہتے ہیں اور پھر مجھ سے کہہ دیتے ہیں کہ بس اب میں تمہارے ساتھ نہیں چل سکتا۔ غالب کا یہ شعر ایک مدت تک مجھے ہانٹ کرتا رہا۔

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں
جاں دادہ ہوائے سر رہگذار تھا

"بارے" کے لفظ سے بارے میں منیر نے بڑی تمکنت کے ساتھ کہا کہ "میرے پاس یہ لفظ پناہ لینے کے لیے آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ غریب الوطن ہے پھر میں نے اسے اپنے اس شعر میں پناہ دے دی۔"

غیروں سے مل کے ہی سہی بے باک تو ہوا
بارے وہ شوخ پہلے سے چالاک تو ہوا

روایت کا ہو کر رہ جانا اور ادبی سجادہ نشینی اختیار کر لینا منیر کو ہرگز پسند نہیں اس کا خیال ہے۔ ''ہم ایک ایسی قوم ہیں کہ ہمارا پچھلا دھڑ روایت نے نگل لیا ہے اور اگلا دھڑ چیخ چلا رہا ہے۔ ہم نے وارث شاہ اور میاں محمد کی جائیداد بیچ بیچ کر نہیں کھائی خود بھی کچھ کرنا ہے۔''

منیر نیازی جرمن ناول نگار ہرمن ہیسے کا بہت قدردان ہے۔ فنی تخلیق پر بات کرتے ہوئے اس نے ہرمن ہیسے کا ایک بہت ہی خوبصورت جملہ Quote کیا۔

''فن کار نیم جان ہوتے ہیں تو ان کے فن پارے زندہ ہوتے ہیں اس لیے کہ وہ ماؤں کی طرح ہوتے ہیں مائیں بچوں کو دودھ پلا کر اپنی طاقت منتقل کر دیتی ہیں اور خود معدوم ہو جاتی ہیں۔''

منیر کی اپنی Vocabulary ہے۔ حسین چیزوں کا ذکر کرنے کے لیے وہ بابرکت اور طیب کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ بد صورت چیزوں اور بدہئیتوں کو بے برکت' غیر طیب' پلید اور خبیث کہہ کر پکارتا ہے۔ اس کے ہاں چڑیلیں' بھوت اور بدروح کے الفاظ ناپاک معاشرتی رویوں کی تمثیلیں ہیں۔ وہ ایک ایسا پاکیزہ اور جمیل معاشرہ دیکھنا چاہتا ہے جس پر کسی آسیب کا سایہ نہ ہو جب میں نے اس سے پوچھا کہ ہمارے معاشرے سے ان بدصورتیوں کو نکالنے کی کوئی سبیل؟ منیر نیازی کا سیدھا جواب تھا کہ

''جیسے رسول اکرم ﷺ نے کیا تھا۔''

حقیقت یہ ہے کہ آرٹ پیشکش کا نام ہے اور منیر پیشکش کے آرٹ کو خوب جانتا ہے۔ وہ گفتگو کرے یا شعر کہے اپنے حسن ادا سے اس میں جان ڈال دیتا ہے۔ منیر کا حلقہ سخن بڑا پرکشش ہے لیکن منیر پر اکتاہٹ طاری ہونے سے پہلے اس حلقے سے باہر نکل آنا ضروری ہے اس لیے کہ بڑی خوبصورت باتیں بھی دہرائی جائیں تو اپنا حسن کھو دیتی ہیں۔

◆◆◆

ہر کوئی نمبردار

انگریزی کا مشہور مقولہ ہے کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے اور آج کل کے بچے کو تو اتنی معلومات حاصل ہیں اور ایسی فہم وفراست کا مالک ہے کہ باپ تو کیا دادا معلوم ہوتا ہے۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ایک چار سال کا بچہ اپنے باپ کی دکان پر باپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ گھر بھی ان کا دکان کے قریب تھا۔

باپ نے بیٹے سے کہا۔ ''بیٹے اب گھر جاؤ' شام ہوگئی ہے۔''

بیٹے نے فوراً جواب دیا۔ ''ابو' شام تو گھر میں بھی ہوگئی ہے۔''

اور بیٹے کا یہ جواب باپ کے ہونٹوں پر خاموشی کی مہر ثبت کر گیا۔

ایک روز میرے چھوٹے بیٹے نے مجھ سے ایک عجیب سوال پوچھا' کہنے لگا۔ ''ابو ہندسوں میں بھی مذکر اور مونث ہوتے ہیں؟''

میں گرامر میں ویسے ہی کمپارٹمنٹ کا کیس ہوں اور یہ سوال تو تھا بھی بہت مشکل اور پیچیدہ۔ اور اس سے پہلے میں نے اس مسئلے پر کبھی غور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے بیٹے سے صاف کہہ دیا کہ بیٹا سوچ کر بتاؤں۔ لیکن یہ سوال میرے ذہن کو اس طرح فیڈ (Feed) کر گیا کہ میں اس مسئلے پر سوچتا چلا گیا۔ میرے ذہن میں فوری طور پر ۵۵ اور ۵۶ کے عدد رینگنے لگے اور ان کے ساتھ ہی اچھن اور چھمن کے نام بھی یاد آ گئے۔ میں مطمئن ہو گیا کہ ہندسے ضرور مذکر ہوں گے لیکن شریفن اور نصیبن کا خیال آتے ہی یہ مفروضہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ ۲۵ اور ۲۶ کی سیریز کے سلسلے میں نفیس اور بلقیس کے نام ان کے مونث ہونے پر دلالت کرتے تھے لیکن رئیس اور انیس وغیرہ کے نام یاد آتے ہی تذکیر وتانیث کا امتیاز پھر دشوار ہو کر رہ گیا۔

پنجابی میں مجھے ستاراں اور اٹھاراں صوتی اعتبار سے گلزاراں اور سرداراں کے بہت قریب لگے اور میں نے ان اعداد کو اس صوتی تشابہ کی بنیاد پر مونث قرار دے دیا۔ اکاسی' بیاسی اور تراسی کا خیال آتے ہی مجھے ماسی کا لفظ یاد آنے لگا اور نتیجتاً یہ سیریز بھی مونث قرار پائی۔ اس ضمن میں نواسی کا عدد میرے لیے سب سے بڑی دلیل تھی۔ اس لیے کہ نواسی بیٹی کی بیٹی کو بھی تو کہتے ہیں اور اس اعتبار سے اس کے مونث ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ کوڑی اور جوڑی بھی مونث کی فہرست میں آتے ہیں۔

اس تحقیق اور تجسس سے مجھ پر یہ انکشاف ہوا کہ اردو کی گنتی کے اعداد جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں مذکر ہوتے جاتے ہیں۔

مثلاً سیکڑہ' ہزار' لاکھ' کروڑ' ارب اور کھرب وغیرہ۔ کئی روز تک میں اعداد کی اس تذکیر و تانیث کی پہچان میں مبتلا رہا اور مجھے یہ احساس ہونے لگا کہ ہندسے تو مجھ پر سوار ہو گئے ہیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ عدد مجھ پر ہی سوار نہیں' یہ تو اس وقت ساری دنیا پر سوار ہیں۔ یہ کمپیوٹرائیج ہے' بڑا نمبری زمانہ ہے۔ اب ذرا ان نمبروں کو شمار تو کیجیے' گلی کے نمبر سے شروع جایئے۔ اگر آپ مقامی ہیں تو آپ کے مکان کا نمبر' مسافر ہیں تو ہوٹل کے کمرے کا نمبر' شناختی کارڈ کا نمبر' موٹر سائیکل کا نمبر' موٹر کار کا نمبر' بنک اکاؤنٹ کا نمبر' دفتر کا ٹیلیفون نمبر' گھر کے ٹیلیفون کا نمبر' اپنے ملک کے مختلف شہروں کے ٹیلیفون کے کوڈ نمبر' بیرون ملک کے کوڈ نمبر' خود انسانی پیکر سے کتنے نمبر چپکے ہوئے ہیں۔ عینک کا پلس اور مائنس نمبر' قمیض کے کالر کا نمبر' جوتے کا نمبر۔۔۔۔۔۔۔ نمبر ہی نمبر اور پھر ان نمبروں کو یاد رکھنے کے لیے ذہن کو کیسی کیسی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ حافظے پر کیسا ریاضیاتی وقت آن پڑا ہے۔ کیسے کیسے فارمولے بنانے پڑتے ہیں۔

میرے ایک دوست کا ٹیلیفون نمبر تین سو چھ' چھ سو نو (306609) ہے۔ میں اس نمبر کو تین سے چھ اور چھ سے نو یعنی فلمی شوز کے حوالے سے یاد رکھتا ہوں اور اس طرح ہر کسی کو سینکڑوں تلازمے ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ آج استاد کو اپنے شاگرد بھی یاد آتے ہیں تو اسی حوالے سے۔ پروفیسر ریاض مجید کے ایک شعر میں اس تجربے کی جھلک ملاحظہ ہو۔

لاکروں میں بند پارینہ رجسٹر رہ گئے
رفتگاں کی یاد ان کے رول نمبر رہ گئے

ایسا لگتا ہے کہ انسانی شخصیت روز بروز عددیت کے مقابلے میں کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ آج کا انسان ارقام کے بوجھ تلے دب کر رہ گیا ہے۔ اس کا وجود ہندسوں میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے اور وہ اعداد کے ہجوم میں تحلیل اور گم ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمیں کیسا المیہ درپیش ہے۔

گھٹ گئے انساں بڑھ گئے نمبر

◆◆◆

عیادت مند

ایک دفعہ میں نے ایک ماہر باورچی سے پوچھا کہ کھانے میں لذت کیسے پیدا ہوتی ہے۔اس کا جواب یہ تھا کہ جو چیز پکائی گئی ہو اس کا ذائقہ باقی سب چیزوں پر بھاری ہونا چاہیے۔مثال کے طور پر اگر مونگ کی دال پکائی گئی ہو اور ذائقہ پیاز کا آ رہا ہو یا کھانے والے کو یہ احساس ہونے لگے کہ اسے مرچوں کی دھونی دی جا رہی ہے یا اسے یوں لگے کہ وہ کیوڑے کی کان میں سانسیں لے رہا ہے تو کھانے میں لذت کہاں سے آئے گی۔ذائقہ تو مونگ کی دال کا آنا چاہیے اور وہ بھی کام و دہن کو۔ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ کھانے والا یہ محسوس کرنے لگے کہ مونگ اس کے سینے پر دلی جا رہی ہے۔"

باورچی کی یہ بات ہماری معاشرتی زندگی کے لیے بھی ایک سنہرے اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ضمنی باتیں اگر اساسی حیثیت اختیار کر جائیں تو زندگی اپنا اصلی ذائقہ کھو بیٹھتی ہے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ مریض کی عیادت ایک کار ثواب ہے اور اس میں مریض کے لیے دلاسے کا پہلو بھی ہے لیکن ہمارے یہاں عیادت کی صورت حال کچھ ایسی پر خلوص ہے کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ بیمار کا علاج ہو رہا ہے۔ایسا لگتا ہے کہ بس عیادت ہو رہی ہے۔جہاں کہیں کوئی مریض ہے منظر یہی ہے کہ مصیبت کا مارا کوئی شخص بستر پر کراہ رہا ہے اور اس کے تن لاغر کے مضافات میں عیادت گزاروں کا ایک جلسہ برپا ہے۔

بڑی رونقیں ہیں مریضوں کے ڈیرے

تیماردار بیچارے بیمار کو چھوڑ کر بیمار پرسی کرنے والوں کی احوال پرسی اور خاطر داری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

عیادت مآب حضرات کی اتنی قسمیں ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ان میں سے ایک قسم ایسی ہے کہ جن کو صرف حاضری لگوانے کا شوق ہوتا ہے وہ اپنی حرکات و سکنات سے مریض اور اس کے اعزہ کو محض یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اس موقع پر ہم بھی آئے ہوئے ہیں اور اس مقصد کی خاطر وہ پوری مجلس عیادت پر چھائے ہوتے ہیں۔

بعض عیادت گزار اپنے بھولپن میں ایسی اذیت ناک ہمدردی فرماتے ہیں کہ بیمار کے شفایاب ہونے کی صلاحیت دفعتاً مرجھا کے رہ جاتی ہے۔شاید کسی ایسے ہی ہمدرد کے بارے میں کہا گیا ہے۔

بھر عیادت آئے وہ پر کس ادا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آواز پا کے ساتھ

اس طرح کے ارباب عیادت مریض کو دیکھ کر عموماً اس طرح کے جملے بولتے ہیں کہ ''ظاہری حالت تو کچھ ایسی اچھی دکھائی نہیں دیتی۔ ویسے اللہ کے رنگ نیارے ہیں۔'' مجھے یاد ہے کہ ایک مجلس عیادت میں میں بھی حاضر تھا۔ مریض کی حالت دیکھ کر ایک صاحب گویا ہوئے۔ ''جب دادا حضور نے انتقال فرمایا تو انتقال سے کچھ دیر پہلے ان کی کیفیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔'' اس کے بعد موصوف نے تیمارداروں کو سورہ یٰسین پڑھنے کا مشورہ بھی دیا۔

تعزیت کا موقع ہو یا عیادت کا ہمارے لیے یہ مرحلے بڑے دشوار ہوتے ہیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہاں جا کر بات کیا کریں گے۔ ایسے موقع پر تسلیاں تو کچھ اور بے قرار کر جاتی ہیں اس لیے کہ متاثرین کرام تو چشم پرنم کی طرح بس بھرے بیٹھے ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس مصلحت کے پیش نظر ہم ایسی مجلسوں میں چپ سادھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔

بعض عیادت کرنے والوں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ بیمار پرسی بھی کتنا بڑا فن ہے اور ہم اس فن میں کتنے بے بضاعت ہیں۔ ایسے عیادت کنندگان کے اندر سے ناگہاں ایسے ٹیپ ریکارڈر چل پڑتے ہیں جن پر ان گنت طبی نسخے' بے شمار دعائیہ کلمات اور بے اندازہ دلاسے ضبط ہوتے ہیں کوئی ان کے بتائے ہوئے نسخے نوٹ کر لے تو زبدۃ حکماء بن جائے۔ دلاسے یاد کر لے تو نفسیاتی طریق علاج کا ماہر ہو جائے۔ مریض کا جو ٹریٹ منٹ ہو رہا ہے ایسے حضرات اس سے سخت بے اطمینانی کا اظہار فرماتے ہیں اور اپنے تجویز کردہ نسخوں کو اکسیر سمجھتے ہیں جن جن مریضوں کو ان کی تجویز کردہ دواؤں سے شفا حاصل ہوئی ہوتی ہے ان سب کے نام گنواتے ہیں۔ بیمار کی خبر گیری کے لیے آتے ہیں اور دنیا بھر کی خبریں سنا جاتے ہیں۔

بعض ماہرین فن عیادت اپنے کسی عزیز کی بیماری کا سن کر بہت دور دراز سے چلے آتے ہیں اور بہت دنوں کے لیے آتے ہیں اور اپنے بچے بھی ہمراہ لاتے ہیں۔ رہائش و خوراک کا انتظام تیمارداروں کی ذمہ داری ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کئی دنوں کے بعد ادھر مریض کی آنکھ لگی اور ادھر ان کے نونہال کبھی ہنس پڑے' کبھی رو پڑے۔ انہیں لاکھ کہیے آپ نے بڑی زحمت فرمائی' آپ کا بہت بہت شکریہ آپ کی دعاؤں سے اب مریض کو افاقہ ہے لیکن وہ بیمار پرسی کی ہٹ کے ایسے پکے ہوتے ہیں کہ مریض جب تک آر یا پار نہ ہو جائے انہیں یاد ہی نہیں آتا کہ ان کا اپنا بھی کوئی گھر ہے۔

ایسے عیادت کرنے والوں کے ہتھے چڑھے ہوئے مریض کے نصیب میں آرام اور آنکھوں میں نیند کہاں اس کے نحیف ہونٹوں

پر بس ایک ہی التجا ہوتی ہے کہ

''مجھے میرے عیادت کرنے والوں سے بچاؤ''

ایسے عیادت کرنے والوں کے برعکس میں نے ایک بے لوث عیادت کرنے والا بھی دیکھا ہے۔ایک ایسا نوجوان میں جسے کبھی نہ بھولوں گا۔وہ ہر روز کسی نہ کسی ہسپتال میں مریضوں سے ملاقات کے اوقات میں ایک لفافے میں کچھ پھل اور کچھ پھول لے کر مختلف وارڈوں میں گھومتا تھا اور جس مریض کے پاس کوئی عیادت کرنے والا نہ ہوتا اس کے پاس پہنچتا۔اسے پھل اور پھول پیش کرتا اور اس کے ساتھ ایسے میٹھے لہجے میں باتیں کرتا کہ بیمار کے چہرے پر رونق' اس کی آنکھوں میں چمک اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ جاتے ہوئے وہ مریض کو اپنا نام بتانا بھی ضروری نہیں سمجھتا۔مریض کے حق میں اس کا سلوک بڑی بڑی اکسیر دعاؤں سے زیادہ شفا بخش تھا۔

کاش سارے عیادت کرنے والے اس گم نام نوجوان جیسے ہو جائیں لیکن کیا کیا جائے کہ عیادت کرنے والوں کی اکثریت ایسی ہے جو تیمارداروں کو بیمار اور بیمار کو اور زیادہ بیمار کر جاتی ہے۔کتنا خوش نصیب ہے وہ مریض جو ایسی مزاج پرسی کرنے والوں کی تشریف آوری سے پہلے صحت یاب ہو جائے۔

کرایہ دار

اگر کسی مصور کے دل میں یہ خواہش کروٹیں لے رہی ہو کہ وہ دنیا میں صدیوں تک کے لیے ایک شاہکار چھوڑ جائے تو ہمارا مشورہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا چہرہ پینٹ کرے جو معصومیت' شرافت اور مسکینی کے انتہائی تاثرات کا مرقع ہو۔ مصور کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ اس دور میں ایسا نجیب اور مسکین چہرہ کہاں سے ملے گا؟ یہ نشاندہی ہمارے ذمے ہے صرف اتنی سی زحمت درکار ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کی ایک جھلک دیکھ لے جو کرائے کا مکان حاصل کرنے کے لیے کسی مالک مکان کے حضور میں کھڑا ہو۔

اگر مصور کی موجودگی ہی میں امیدوار کو مکان کی چابی مل جائے تو وہ اپنی شاہکار تصویر کے دوسرے رخ کی جھلکیاں بھی دیکھ سکتا ہے۔ تصویر کے پہلے رخ کی تصویر کشی مصور پر چھوڑتے ہوئے دوسرے اور اصلی رخ کی عکاسی کی ہم اپنے طور پر کچھ کوشش کر دیکھتے ہیں۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ "خانہ خالی را دیو می گیرد" یعنی خالی گھر میں جن اور بھوت گھس جاتے ہیں اور بھوتوں کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ گھر سے آسانی سے نہیں نکلتے۔ اکثر کرایہ دار بھی اسی قبیل کے ہوتے ہیں جن کو کرائے کے مکان سے بھوت جیسی پریت ہو جاتی ہے اور صورت حال میر حسن کے شعر کی الٹی شکل بن جاتی ہے۔

یہ گھر تیرا ہے میرا نہیں
مگر اب یہ میرا ہے تیرا نہیں

ایسے کرایہ دار بڑے خلوص کے ساتھ مرزا داغ دہلوی کے مسلک کی پابندی کرتے ہیں۔

حضرت داغ جہاں بیٹھ گئے' بیٹھ گئے

کرایہ داروں کی یہ قسم ایسی ہے کہ جہاں سے اٹھ سکتے ہیں مکان سے نہیں اٹھائے جا سکتے' مکان چاہے حکومت کا ہی کیوں نہ ہو۔

ایک صاحب کے بارے میں سنا گیا ہے کہ گورنمنٹ سروس سے ریٹائر ہوئے انہیں سات سال کا عرصہ ہو گیا ہے لیکن سرکاری رہائش گاہ میں ابھی تک براجمان ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ یہ مکان اس بنت حوا کے نام ہے جو میری اہلیہ ہے یعنی وہ ہستی جسے جنت سے نکلنے کے بعد اب کسی مکان سے بے دخل ہونا کسی صورت گوارا نہیں۔ اپنے اس دعوے میں وہ ہر قسم کی کاغذی گواہیاں بھی فراہم کر

چکے ہیں اور گزشتہ سات برس سے مسلسل مقدمہ لڑ رہے ہیں۔

بعض کرایہ دار ایسے دانشور واقع ہوئے ہیں جنہوں نے مالک مکان کو ہی نہیں عدالتوں کو بھی چکر میں ڈال رکھا ہے۔ طریقہ واردات یہ اپنایا ہے کہ بحالیات کے کارندوں سے چپکے چپکے ربط بڑھا لیا تھا اور نتیجہ یہ نکلا کہ محکمے کی نگاہ کرم دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی۔ الاٹمنٹ اگر مالک مکان کے پاس ہے تو کرایہ دار کے پاس بھی ہے۔ اب فیصلہ کیسے ہو۔ مقدمہ آٹومیٹک گھڑی کی طرح مسلسل چل رہا ہے۔

ہمارے ایک دوست س ایسے ہیں جنہیں مالک مکان ہونے کی صعوبت حاصل ہے۔ ہوا یوں کہ ایک شریف آدمی کو مکان کرائے پر دے کر خود لاہور شفٹ ہو گئے تھے۔ ایک سال کے بعد واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ کرایہ دار موصوف نے بیٹھک کا دروازہ توڑ کر اسے اپنی نئی نویلی گاڑی کے لیے گیراج میں تبدیل کر لیا ہے۔ کرایہ دار نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہاں پر بیٹھک نام کی کوئی چیز کبھی موجود ہی نہیں تھی۔ گزشتہ تین سال سے ہمارے دوست عدالتوں میں یہ ثابت کرتے پھر رہے ہیں کہ یہاں گیراج نہیں تھا' بیٹھک تھی۔ ہم نے انہیں بہت پہلے سمجھایا تھا کہ میاں اس چکر میں نہ پڑو اور خوب سمجھ لو کہ جو شخص بیٹھک کا دروازہ توڑ سکتا ہے گواہوں کو توڑنا اس کے لیے کیا مشکل ہے۔

ایک کرایہ دار صاحب ایسے ہیں جنہوں نے ایک عرصہ سے صاحب مکان کو کرایہ دینا بند کر دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ اب مالک کو پہچاننے سے انکاری ہیں اور وہ بیچارہ دنیا جہان کے سارے دھندے چھوڑ کر کچہری میں یہ ثبوت فراہم کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں ہی اصلی مالک مکان ہوں اس لیے کہ ایک جعلی مالک مکان کرائے کی نقلی رسیدیں دکھا کر اس دعوے کی شدت سے تردید کر رہا ہے۔ کرایہ دار نے اپنے موقف کو مزید مضبوط بنانے کے لیے سوئی گیس کا میٹر اپنے نام لگوا لیا ہے اور گیس کے میٹر کی ملکیت نے اس کے دماغ میں ایسی ہوا بھر دی ہے جو بسا اوقات آندھی کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔

کچھ آزمودہ کار کرایہ دار صاحب مکان کو اس حسن اسلوب سے ستاتے ہیں کہ بے چارہ زچ ہو کر انہی کے ہاتھوں سستے داموں مکان فروخت کر دے اور اپنی جان چھڑائے ورنہ تاریخیں بھگتے۔

پچھلے دنوں کا ایک واقعہ ہے کہ ایک مالک مکان خوبیٔ قسمت سے اپنے کرایہ دار سے آخری معرکے میں جیت گئے اور پانچ چھ سال کے مقدمے کے بعد فیصلہ ان کے حق میں ہو گیا۔ دو دن بعد پولیس نے قبضہ دلوانا تھا۔ شکست خوردہ کرایہ دار پولیس کے آنے سے ایک دو روز پہلے مقبوضہ مکان چھوڑ گیا' لیکن اس طرح کہ جوش انتقام میں دروازوں کو دیواروں اور دیواروں کو دروازوں میں

تبدیل کر گیا۔ جس جس چیز میں آتش پذیری کی صلاحیت تھی اسے دھوئیں سے راکھ تک کی ساری منزلیں طے کروا گیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ کرایہ دار تو نکل گیا لیکن نقصان کے صدمے سے مالک مکان کے تن کی حویلی سے اس کی روح بھی نکل گئی۔

اس کے برعکس ایک کرایہ دار ایسا بھی ہوتا ہے جو مکان کی صورت بگاڑتا نہیں بلکہ بناتا ہے اور بنائے چلا جاتا ہے۔ کبھی پردے کی اہمیت کے پیش نظر منڈیر اونچی کرا دے گا کبھی فرش اکھڑوا کر نیا بنوا لے گا' کبھی مکان پر پلستر اور رنگ و روغن کی نئی تہیں چڑھا لے گا لیکن مرمت کا سارا خرچ دھڑلے سے کرائے میں کاٹے گا۔ ایک صاحب کو اپنے ایک ایسے ہی کرایہ دار سے آج تک پھوٹی کوڑی وصولی نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ کرایہ دار۔۔۔۔۔۔۔ آرائش مکان سے فارغ نہیں ہنوز۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ سارے کرایہ دار ایسے ہوتے ہیں ایسا ہرگز نہیں لیکن ایک بات ضرور ہے کہ کسی گھر میں تو یہ ممکن ہے کہ ساس اور بہو میں نوک جھونک نہ رہتی ہو لیکن دو طرفہ شرافتوں کے باوجود مالک مکان اور کرایہ دار میں ضرور ٹھن جاتی ہے اور بالخصوص کرائے کی رقم بڑھانے کے سلسلے میں تکرار تو ہو کر رہتی ہے اس لیے کہ کرایہ دار اور مالک مکان کے تعلق کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ ایک کا فائدہ دوسرے کا سراسر نقصان ہے اور اپنا مفاد کسے عزیز نہیں ہوتا؟

مہنگائی نے کرایہ دار اور مالک مکان کے درمیان گرم گفتاریوں کا ایسا سلسلہ چھیڑ دیا ہے جو اکثر اوقات دراز دستیوں تک پہنچ جاتا ہے اس مسئلے نے کرایہ دار کو اپنے مالک مکان کا ہی نہیں دوسرے کرایہ دار کا بھی دشمن بنا دیا ہے۔ نیا کرایہ دار پرانے کرایہ دار کو بے دخل کرانے کے لیے دونوں ہاتھوں سے ہزاروں لاکھوں روپے کی پگڑی تھامے ہوئے کرائے کی بڑے سے بڑی بولی دے رہا ہے۔ اسے یہ سوچنے کی فرصت کہاں کہ۔۔۔۔۔۔۔ اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گے۔

ہمارے حلقہ احباب میں ایک صاحب اتفاق سے رینٹ کنٹرولر ہیں انہوں نے حال ہی میں ایک مکان بنوایا ہے۔ مکان کے دو کمرے خالی پڑے ہیں اور کرائے پر اٹھائے جا سکتے ہیں لیکن اپنے منصبی تجربے کی بنیاد پر یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کسی کرایہ دار کو ان کمروں میں رونق افروز ہونے کا شرف نہیں بخشیں گے۔ ان کا مقولہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ صاحب جائیداد ہونا ضرورت سے زیادہ پریشان ہونے والی بات ہے۔ کرایہ دار تو وہ مخلوق ہے جو بھونچال میں بھی گھر چھوڑ کر نہیں بھاگتی۔

◆◆◆

چھوٹے بڑے

ہمارے ہاں چھوٹے اور بڑے کے الفاظ اس قدر رواج پا چکے ہیں کہ بعض چیزوں کی شناخت بن گئے ہیں۔ مثال کے طور پر چھوٹا منہ' بڑی بات ------ بڑے میاں اور چھوٹے میاں ------ چھوٹے دن بڑی راتیں ------ بڑے دن چھوٹی راتیں ------ چھوٹے صاحب بڑے صاحب ------ اور اسی طرح چھوٹی عید اور بڑی عید ------ اور اسی سے یاد آیا چھوٹا گوشت اور بڑا گوشت ------ اور عجیب بات یہ ہے کہ چھوٹے گوشت کے چاہے کتنے بڑے بڑے پیس کاٹ لیجئے چھوٹا ہی کہلائے گا اور بڑے گوشت کا اسے دو دفعہ قیمہ کرا لیجئے بڑا ہی رہے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جسے اللہ نے بڑائی دی ہو اس میں کمی کوئی نہیں کر سکتا۔ کوئی سائنس کا پورا زور لگا لے وہی بڑے' وہی چھوٹے نہیں بن سکتے۔

اسی چھوٹی عید پر ہم نے یہ پیشگوئی کی تھی کہ دیکھ لینا اس عید پر قیمتیں چھوٹی نہیں رہیں گی۔ اس لیے کہ ہمیں یہ اندازہ تھا کہ رمضان' عید اور بجٹ ایک سیدھ میں آ رہے ہیں۔ قوت خرید کو گہ لگ جائے گا۔ شعری زبان میں ہم نے یہ بات یوں کہی تھی۔

ایسا ضرور ہو گا ہمارے خیال میں
ایسا اگر نہ ہو تو یہ کیسا عجیب ہے
بڑھ جائے گر گراف گرانی تو کیا بعید
نزدیک عید بھی ہے بجٹ بھی قریب ہے

ملک کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بجٹ کا مہنگائی کو جنم دینے والا ایک بڑا حصہ واپس لے لیا گیا۔ لیکن چڑھی ہوئی قیمتیں کہاں واپس آتی ہیں۔ قیمتوں میں ایک نباتاتی روش پائی جاتی ہے۔ بیلوں کی طرح بڑھی' چڑھتی اور چمٹتی چلی جاتی ہیں۔ دو چیزیں بڑی نایاب ہیں کہ بڑی عید کے پہلے دن قصائی نہیں ملتا اور دوسری بات یہ ہے کہ قیمتوں کو اذن پسپائی نہیں ملتا۔

چھوٹی عید سے وابستہ خورد و نوش کی چیزوں کی قیمتیں آخر کہاں تک بڑھ سکتی ہیں۔ سویاں آخر کتنی مہنگی ہو جائیں گی۔ دودھ اور چینی ایک دو روپے فی کلو چڑھ جائیں گی۔ بادام' پستے اور کھوپے کا ریٹ آخر کہاں تک بڑھے گا۔ چھوٹی عید پر قیمتیں بھی بہرحال بڑی عید کی قیمتوں کے مقابلے میں چھوٹی ہی رہیں گی۔ بڑی عید کی تو ہر بات بڑی ہوتی ہے۔ مرغا خریدنے جائیے اور بکرے کا ریٹ سن کر آ

جایئے۔ بکرے کا نرخ پوچھیے تو گائے سے زیادہ اور گائے اونٹ کی قیمت پر بھی ہاتھ نہ آئے۔

بکرا منڈی جو لگتی ہے وہ ایک تماشا ہے' دیکھنے کا اور نہ چھو سکنے کا۔ میں متوسط درجے کا ایک تنخواہ دار' سوچنے پر مجبور۔

جب میری پینچ میں کوئی سودا ہی نہیں ہے
پھر کس لیے لگتا ہے یہ میلہ مرے آگے
میں ایک سبک جیب اِدھر کا نہ اُدھر کا
بکرا مرے پیچھے ہے تو لیلا مرے آگے

کیا زمانہ آن لگا ہے کہ مہنگائی کے ہاتھوں دینی فرائض کی ادائیگی دشوار سے دشوار تر ہوتی جا رہی ہے۔

ہمارا سب سے بڑا المیہ یہی تو ہے کہ نیکی کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ انسان آرزو کے سہارے زندہ ہے۔ میری بھی ایک آرزو ہے کہ چراگاہوں کو بڑی بڑی کالی بھیڑوں سے بچایا جائے۔ کوئی تو ہو جو ناجائز منافع خور اور ذخیرہ اندوز کے دل میں خدا کا خوف ڈال دے۔ اس سلسلے میں مجھے بڑے بلند بانگ دعویٰ فروش کی تلاش نہیں ہے۔ میں تو اس بچے کو ڈھونڈ رہا ہوں جس کا ننھا سا جملہ میرے کانوں میں گونجتا رہا ہے۔

میں بچہ ہوں اک چھوٹا سا اور کام کروں گا بڑے بڑے

◆◆◆

مسقط میں مشاعرہ

گزشتہ دنوں مسقط میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں شرکت کے لیے جو دعوت نامہ موصول ہوا اس کا مضمون یہ تھا۔

''احباب مسقط کی جانب سے سلطنت عمان کے دارالحکومت مسقط میں ۷ مئی ۱۹۹۲ء بروز جمعرات ایک محفل مشاعرہ منعقد ہو رہی ہے۔اس مشاعرہ میں آپ اپنے کلام سے نوازیں۔آپ کے ہزاروں مداحوں کا شدید اصرار ہے۔''

اسی مضمون کا ایک دعوت نامہ امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی اور حسن رضوی کو موصول ہوا۔خط لکھنے والے کا نام مروت احمد تھا۔

جب میں نے غور کیا کہ نگاہ انتخاب آخر ہم چاروں پر ہی کیوں پڑی ہے تو بہت سی مشترک قدریں دریافت ہوئیں۔چاروں شاعر اور چاروں شعبہ تدریس سے منسلک۔۔۔۔۔۔تھوڑا سا فرق یہ تھا کہ تین اردو کے پروفیسر اور میں فارسی پڑھانے والا۔عطاء الحق قاسمی اور حسن رضوی میں مزید ایک قدر مشترک' یہ کہ دونوں اردو کے بڑے موقر روز ناموں سے وابستہ۔عطاء نوائے وقت کا کالم نگار (اسی نسبت سے میں اسے عطاء الحق کالمی کہتا ہوں) اور حسن رضوی روز نامہ ''جنگ'' لاہور کے ادبی صفحے کا انچارج۔عطاء اور امجد میں ایک قدر مشترک یہ ہے کہ باہمی نوک جھونک پر ہمہ وقت آمادہ' لطیفے پر لطیفہ چھوڑنا ان کا خاص مشغلہ۔یہ دونوں اکٹھے ہوں تو ڈھیر سارے لطیفے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

ٹکٹ موصول ہوا تو ۶ مئی کو مجھے اسلام آباد سے کراچی پہنچنا تھا اور اسی روز کراچی سے پانچ بجے بعد از ظہر براستہ ابوظہبی' مسقط روانہ ہونا تھا۔تین بجے لاہور سے باقی تینوں درویش بھی کراچی پہنچ چکے تھے۔اس فلائٹ میں بہت سے ہندوستانی اور فلپائنی بھی سوار ہوئے جو مسقط میں دکانوں اور گھروں میں ملازمت کرتے ہیں۔

عطاء الحق قاسمی جہاز میں بیٹھتے ہی اونگھنے لگے۔عطاء اور حسن ایک طرف بیٹھے تھے اور میں اور امجد دوسری طرف اور اس طرح خواہ مخواہ دو پارٹیاں وجود میں آ گئیں۔امجد نے مجھ سے کہا کہ ان پر فوری طور پر ایک قطعہ ہو جانا چاہیے اور ان کو وارننگ دے دی کہ امام ضامن باندھ لو۔میں نے ارتجالاً قطعہ کہہ کر بورڈنگ کارڈ کے بقیہ حصے پر تحریر کیا اور امجد کی وساطت سے حسن کو پہنچا دیا۔

نیندیں ہی اس کی دین نہیں رتجگے بھی ہیں
جو جس کو بھی عطا کرے وہ بے نیاز ہے

ہے محو خواب قاسمؔ بیدار ہے حسن
”فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے“

جو ائیر ہوسٹس ہماری طرف مامور تھی اس سے ہم نے جب بھی کوئی بات پنجابی میں پوچھی اس نے انگریزی میں جواب دیا۔اس کو انگریزی بولنے کا اسی طرح شوق تھا جیسے ہمارے میڈیکل ریپ انگریزی بولتے ہیں۔ڈاکٹر پنجابی میں بات کر رہا ہو اور وہ اپنی انگریزی انڈیلتے چلے جاتے ہیں۔بعد میں معلوم ہوا کہ ائیر ہوسٹس لاہور کی رہنے والی ہے اور فضائی میزبان کی تربیت پانے کے بعد یہ اس کی پہلی پرواز ہے۔اس نئے تجربے سے وہ اچھی خاصی نروس لگ رہی تھی۔بار بار کہتی تھی کہ ”بہت مشکل ہے یہ میری پہلی فلائٹ ہے۔“ کچھ دیر بعد ائیر ہوسٹس پیپسی کے چار چھلکتے ہوئے کاغذی گلاس لے کر آئی۔جب ہم نوش کر چکے تو وہ گلاس واپس لینے کے لیے آئی۔

“Glasses Please_______”

امجد نے چشمہ اتار کے اس کے حوالے کر دیا اور ساتھ ہی ہمیں یہ واقعہ سنایا۔

”جب میں بی اے کا طالب علم تھا تو اسلامیہ کالج لاہور کی بزم اقبال کا سیکرٹری بھی تھا۔کالج کا سالانہ بین الجامعی شمع تاثیر مشاعرہ ہونے والا تھا۔میری اور دوسرے اراکین بزم کی شدید خواہش تھی کہ مشاعرے کی صدارت کے لیے بیگم تاثیر کو دعوت دے دی جائے۔دعوت دینے کے لیے ان کے ہاں جانے کے لیے ہم نے بہت سے انگریزی کے جملے سوچ رکھے تھے۔وہ گرمجوشی سے ملیں اور ہم نے سوچی ہوئی ساری انگریزی فرفر بولنی شروع کر دی۔جب ہم اپنی غلط سلط انگریزی کا سارا خزانہ خرچ کر چکے تو انہوں نے بڑی سادہ سی اردو میں ہم سے پوچھا۔”آپ لوگ چائے پئیں گے کہ شربت؟“

اردو کے سامنے انگریزی اتنی شرمسار کبھی نہیں ہوئی ہوگی۔ائیر ہوسٹس نے ان سب کو اچانک بتایا کہ ”میرے پاس انور مسعود صاحب کا آٹوگراف ابھی تک محفوظ ہے۔“ تو یہ جملہ ان تینوں درویشوں کے لیے کافی بھاری تھا۔عطاء الحق قاسمی جناب وزیر اعظم نواز شریف صاحب کے ہمراہ دورۂ کابل سے ایک دو روز قبل ہی واپس ہوئے تھے۔کابل میں انہوں نے صرف تین گھنٹے گزارے تھے۔وہاں پر وہ شاہی مہمان تھے۔کابل کی ویرانی اور بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ اس دوران قیام میں وہاں پر انہوں نے صرف پانی کا ایک گلاس پیا۔اس صورت حال پر عطا کا تبصرہ شنیدنی ہے۔

”نجیب اللہ نے اقتدار چھوڑا ہے تو آخر اس کا کوئی سبب تھا۔اب وہاں اقتدار کے لیے باقی رہ ہی کیا گیا تھا۔“

مسقط ائیر پورٹ پر جا کر معلوم ہوا کہ عطاء الحق قاسمی صاحب کے ویزے کا پھڈا پڑ گیا تھا اور یہ واقعہ قاسمی صاحب کے ساتھ دوسری مرتبہ ہوا۔ قطر میں بھی یہی پھڈا پڑ چکا تھا۔ اس سلسلے میں دونوں مرتبہ ان کی ولدیت ان کے آڑے آئی تھی۔ قاسمی صاحب معروف عالم دین مولانا بہاء الحق قاسمی (مرحوم) کے صاحبزادے ہیں۔ دیگر عرب امارات کی طرح اہل مسقط بھی بہاء کے لفظ سے بڑے الرجک ہیں۔ اس لیے کہ بہائی فرقے کے پیروکاروں کا عرب امارات میں داخلہ سختی سے ممنوع ہے۔ بہاء الحق کے نام سے انہیں یہ مغالطہ ہو گیا کہ عطاء الحق قاسمی کا تعلق بھی اسی فرقے سے ہے۔ ہمارے میزبانوں نے بڑے جتنوں سے مسقط ائیر پورٹ کے کارپردازوں کو یہ یقین دلایا کہ عطاء الحق قاسمی الحمدللہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں اور ہرگز بہائی نہیں ہیں۔ یہ مسئلہ مثبت انداز سے حل نہ ہوتا تو عطا کو ائیر پورٹ سے واپسی پرواز پر کراچی ارسال کر دیا جاتا۔ رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت۔ عطاء صاحب کے بڑے بھائی اور معروف مزاحیہ ضیاء الحق قاسمی صاحب ابھی تک مسقط تشریف نہیں لے گئے۔ ظاہر ہے برادر بزرگ کو اس ضمن میں اشکال بزرگ پیش آنے کا قوی احتمال ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں بھی مسقط لے جائے اور اس آزمائش سے محفوظ رکھے۔ آمین!

مشاعرے کے احوال کے بیان سے پہلے یہ بہت مناسب معلوم ہوتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔ بارے مسقط کا کچھ بیاں ہو جائے۔ عرب ممالک میں سے مسقط ہمارا بہت ہی قریبی ہمسایہ ہے' یہاں تک کہ کراچی سے مسقط کا سفر اسلام آباد سے کراچی کے سفر سے بھی کم ہے (اگر جہاز مستقیماً مسقط جائے) شہر مسقط سلطنت عمان کا دارالحکومت ہے۔ ناظر کی پہلی نظر اس شہر کی نزہت و نظافت میں کھو کر رہ جاتی ہے۔ بلا مبالغہ یہ دنیا کا سب سے زیادہ صاف ستھرا اور بہت ہی ماڈرن شہر ہے۔ پرانے محلے شہر کے پہلو میں اور بعض پرانے قلعوں پہاڑوں کی چوٹیوں پر آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ قدیم و جدید کا یہ امتزاج بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ صفائی کی رعایت ہر جگہ ملحوظ رکھی گئی ہے۔ چٹیل پہاڑوں کو کاٹ کر نہایت خوبصورت سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ بے آب و گیاہ پہاڑوں کے درمیان جدید ترین سڑکوں' جدید ترین عمارتوں' جدید ترین پلازوں اور جدید ترین ہوٹلوں کی ایک دنیا آباد ہو گئی ہے۔ بلڈنگیں تو آج کل ہر ماڈرن شہر میں ایک سی دکھائی دیتی ہیں۔ اصل مسئلہ گلیوں اور بازاروں سے گزرنے کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ یہ ہے کہ کسی مقام سے گزرتے ہوئے آپ کن کیفیات سے گزرتے ہیں۔ عرب دنیا اس وقت بود و باش کے اعتبار سے کتنی جدید ہے لیکن بعض اعتبارات سے کتنی عقب ماندہ ہے۔

مسقط کے پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ سمندر اپنے آبی ذخیروں کے ساتھ کہیں ساکن ہے اور کہیں موجزن' کوہسار جب ساحل دریا بھی ہو تو اس کا اپنا ایک حسن ہے۔ موجودہ سلطان قابوس بن سعید نے نہ صرف اس شہر میں بلکہ عمان کے دیہاتوں اور بستیوں تک

بنیادی ضروریات اور سہولتیں اس فراوانی سے فراہم کردی ہیں کہ اہل مسقط اپنے سلطان کے بے انتہا گرویدہ ہیں۔ سلطان اپنے ملک کے مختلف شہروں اور دیہاتوں کا دورہ کرتے رہتے ہیں اور عوام سے اپنا رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ ان کی شکایات سنتے ہیں' درخواستیں وصول کرتے ہیں اور لوگوں کی مشکلات بلا تاخیر رفع کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ ملک میں دور دور تک سکول اور ہیلتھ سنٹر بنا دیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ موبائل ہیلتھ سنٹروں کا بھی معقول انتظام ہے۔

۱۹۸۰ء سے پہلے کا مسقط آج کے مسقط سے بالکل مختلف تھا۔ تعمیر و ترقی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ گاڑیوں کی تیز رفتاری کو شرماتی ہے۔ بالخصوص ہریالی اور پیڑوں کی کثرت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ خشک پہاڑوں اور صحراؤں کا لہلہاتے ہوئے سبزہ زاروں میں تبدیل ہو جانا کس طرح ممکن ہوا ہے۔ صرف دولت سے یہ سب کچھ نہیں ہو سکتا۔ تعمیر وطن کی لگن اور خلوص کی دولت کے بغیر ایسے کارنامے انجام نہیں پا سکتے۔

عمان کی بڑی پیداوار تیل' مچھلی اور کھجور ہے۔ آج سے بیس سال پہلے یہاں پر انار بہت کثرت سے پیدا ہوتا تھا اور ہندوستان بھی بھیجا جاتا تھا۔ اب انار کی کاشت میں بہت کمی آ گئی ہے۔ یہ جان کر دکھ ہوا کہ اہل مسقط ہندوستان سے اور دیگر ممالک سے بہت کثرت سے گوشت' پھل اور سبزیاں درآمد کرتے ہیں۔ کاش پی آئی اے صرف کراچی سے نہیں بلکہ لاہور سے مسقط کی پروازوں کا اہتمام بھی کرے تاکہ چیزیں پاکستان سے عمان بھجوائی جائیں۔ ہمارے موجودہ سفیر اس بات کے بہت خواہشمند ہیں کہ مسقط اور پاکستان کے تجارتی تعلقات میں خاطر خواہ اضافہ ہو۔ یہ بات اس لیے بھی ضروری ہے کہ عرب ریاستوں میں سعودی عرب اور بحرین کے بعد پاکستان کی سب سے زیادہ عزت عمان میں ہے۔ اس باہمی احترام کو ہر پہلو سے فروغ اور استحکام حاصل ہونا چاہیے۔

سلالہ عمان کا بہت خوبصورت شہر ہے۔ یہ شہر مسقط سے کافی فاصلے پر ہے اور یمن سے قریب ہے۔ مون سون کے بادل یہاں کے پہاڑوں پر اتنی آبشاریں گراتے ہیں کہ پتھر سرسبز ہو جاتے ہیں۔ بارشیں تھمتی ہیں تو دو ہفتے کے اندر اندر یہ سبزہ بالکل جھلس کر رہ جاتا ہے اور چند دنوں میں ہریالی راکھ بن جاتی ہے۔

عمانیوں کا قومی لباس ہر زمان و مکان میں ایک سا رہتا ہے۔ عام زندگی میں بھی اور تقریبوں اور تہواروں میں بھی یہ لباس سفید عبا اور سفید پگڑی پر مشتمل ہوتا ہے۔ عمانیوں نے اسے یونیفارم کی طرح پوری پابندی سے اپنا رکھا ہے۔ اگر کوئی غیر ملکی عمان کی قومیت حاصل کر لیتا ہے تو پھر اسے بھی یہی لباس پہننا پڑتا ہے۔ غیر ملکیوں پر ایسی کوئی پابندی نہیں۔

عرب امارات میں ہوٹلوں اور مسجدوں کی عمارتیں ایسی دیدہ زیب ہیں کہ انہیں صرف دیدہ زیب کہنے سے ان کے حسن و

زیبائش کے بیان کا حق ادا نہیں ہوتا۔شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔قطر‘ ابوظہبی‘ دوبئی‘ شارجہ اور مسقط ان سب ریاستوں میں ایسی عمارتیں انتہائی عالی شان ہیں۔مسجدوں کے سلسلے میں معجزہ فن کی نمود خاص طور پر حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

اس ضمن میں مسقط کا ہوٹل البستان خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ ۱۹۸۵ء میں سلطان کے پندرھویں سال جلوس کی اہم تقریبات اسی ہوٹل میں برپا ہوئیں۔دنیا بھر کے سربراہان مملکت کو اسی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ضیاء الحق مرحوم اس تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔اس ہوٹل کے سیر کے دوران امجد اسلام امجد نے جب اس عظیم جشن کا احوال سنا تو اس کے تبصرے میں یہ جملہ بھی شامل تھا۔

"بہت چھوٹے اور غریب ملکوں کے حکمران تو ہوٹل کے کمروں سے ٹونٹیاں اتار کر لے گئے ہوں گے۔بھائی! اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں‘ بعض بادشاہ بھی بڑے مفلس اور ضرورت مند ہوتے ہیں۔"

اس جشن کے موقع پر شہر اور ہوٹل البستان میں بے نظیر چراغاں کیا گیا۔سویلین اور آرمی کے ملازمین کے دو دو بونس دیئے گئے۔عمانیوں کو تین تین تنخواہیں دی گئیں اور لوگوں کو حسن کارکردگی پر کثرت سے سلور اور گولڈ میڈل عطا کئے گئے۔

کالرج نے شاعری کی جو یہ تعریف کی ہے کہ

"Best Words in the Best Order"

یہ ہر فن لطیف اور ہر ہنر زیبا پر صادق آتی ہے۔فن سنگ وخشت کا کمال بھی اسی حسن ترتیب سے وابستہ ہے۔بہترین لکڑی‘ پتھر اور شیشے کی بہترین ترتیب ہی معماری کے اونچے معیار کی ضامن ہے۔بس یہی کچھ ہوٹل البستان کی خوبی ہے اور اس دور میں اس خوبی میں اس کی ہمسر شاید ہی کوئی عمارت ہو۔زیبائی‘ اسلامی طرز تعمیر کی کشادگی اور جدید ترین اسلوب تزئین و آرائش کے امتزاج نے مسقط کے پہاڑی سلسلے کے ایک زاویے میں ساحل سمندر پر ایک عجیب شاہکار تخلیق کیا ہے۔

ہر ناظر کی نگاہ کسی بھی منظر میں وہ کچھ دیکھتی ہے جو دوسروں کو دکھائی نہیں دیتا۔مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۹۸۶ء میں جب میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے انڈیا گیا اور اس سفر میں مجھے آگرہ جانے کا اتفاق ہوا اور تاج محل دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے وہاں پر ایک ایسی چیز دیکھی جس کا تذکرہ کسی کتاب میں نہیں پڑھا تھا اور نہ کسی سے سنا تھا۔تاج محل جس احاطے میں ہے اس کے باہر سرخ رنگ کا ایک بہت بڑا گیٹ ہے جب تک اس گیٹ سے گزر نہیں جاتے تاج محل دکھائی نہیں دیتا۔گویا یہ گیٹ سرخ رنگ کا گھونگھٹ ہے۔یہ گھونگھٹ اٹھتا ہے تو نگاہوں کو تاج کے رخ زیبا کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔یہ التزام دیکھ کر مجھے یوں لگا کہ میں دنیائے جمال کا ایک نیا علاقہ دریافت کرلیا ہے۔

ان مہربانوں میزبانوں میں جس شخصیت نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ہمارے ملک کے سفیر سلطان حیات خان صاحب ہیں۔ میں ۱۹۸۹ء میں جب جدہ گیا تو وہ اس وقت وہاں سفارتی فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہاں پر وہ اتنے خلوص سے پیش آئے تھے کہ جی چاہتا تھا کہ ان سے پھر بھی کہیں ملاقات ہو۔ الحمدللہ کہ آج کل وہ مسقط میں پاکستان کے سفیر ہیں۔ انہوں نے جس خلوص کا مظاہرہ کیا الفاظ اس کے تذکرے سے یکسر قاصر ہیں۔ اپنے وطن سے اور وطن کے احوال و مسائل سے انہیں بے انتہا دلچسپی ہے اور وطن سے آنے والوں کے ساتھ وہ جس محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں سول سروس کی شخصیتوں میں یہ تپاک بہت ہی نادر ہے۔ سلطان حیات خان صاحب اپنے مہمانوں سے اس خلوص سے ملتے ہیں کہ وہ تاحیات ان کے ممنون ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ہم جتنے دن مسقط میں رہے حیات صاحب برابر ہماری خیریت سے دریافت کرتے رہے بلکہ ہر اس تقریب میں تشریف لائے جو کہیں بھی ہمارے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ مشاعرے کی دوسری شام انہوں نے اپنے سفارت کدے پر ایک منی محفل مشاعرہ منعقد کی جس میں ہم چاروں درویش کلام سنانے کے لیے مدعو کئے گئے۔ مشاعرے میں انہوں نے مسقط کی سب بہت سی چیدہ چیدہ شخصیات کو مدعو کیا اور مشاعرے سے پہلے بڑے پر تکلف ڈنر کا اہتمام کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جب پاکستان کی ٹیم نے کرکٹ کا ورلڈ کپ جیتا تو ان کو نہ صرف عمانیوں کی طرف سے مبارک کے ٹیلیفون اور تار موصول ہوئے بلکہ مسقط کے بھارتی سفارتکاروں نے بھی انہیں مبارک کے پیغامات ارسال کئے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ بیرونی دنیا میں پاکستان کا وقار بلند کرنے کے لیے پاکستان کو سلطان حیات خان جیسے سفارت کاروں کی انتہائی ضرورت ہے۔

اس ضمن میں مروت احمد کا ذکر نہ کرنا بڑی بے مروتی ہوگی۔ کسی بھی مشاعرے میں یا تقریب کے انتظام میں ایک کارکن بھی مروت احمد جیسا بے لوث ہو تو اس تقریب کے ناکام ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مروت اس مشاعرے کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اس شخص کا انکسار اس درجے کا تھا جیسے وہ ہر وقت ایک عالم معذرت میں ہو۔ جی، جی، جناب اور جی ہاں سے زیادہ وہ کچھ نہیں بولتا تھا۔ اس سے زیادہ اس کو بولنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ انگریزی کے اس مقولے کی سچی مثال ہے کہ

"Action Speaks Louder than Words"

مروت احمد سے بڑھ کر اسم با مسمیٰ میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا۔ وہ اپنے نام کی تجسیم ہے۔ کیمرہ اس کے گلے کا ہار ہو کر رہ گیا تھا۔ ہم نے کہیں بھی اس کیمرے کے بغیر نہیں دیکھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہمارے دوران قیام کا ایک ایک لمحہ کیمرے کی آنکھ سے شکار کر لیا جائے۔ ہماری واپسی کے وقت اس نے ہم چاروں کو جو تصویروں کا البم پیش کیا۔ وہ اس کی ماہرانہ عکس برادری کی نادر مثال ہے۔

مشاعرے کے ناظم اعلیٰ نے مشاعرے کے اہتمام کے سلسلے میں ہر مقام پر نہایت اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیا۔
مسقط میں مشاعرے کا جو دعوت نامہ تقسیم کیا گیا وہ بھی ایک منفرد چیز تھی۔ اس دعوت نامے میں امجد اسلام امجدؔ عطاء الحق قاسمی حسن رضوی اور میری پاسپورٹ سائز تصویریں چھپی ہوئی تھیں اور ہر تصویر کے نیچے صاحب تصویر کا ایک منتخب شعر درج تھا۔ مدعوئین کو بچوں کو ساتھ نہ لانے کی درخواست کرتے ہوئے بڑا دلچسپ پیرایہ اختیار کیا گیا تھا کہ تحریر سے کسی کا دل نہ دکھ جائے اور کوئی بچہ بھی مشاعرہ گاہ پہنچنے نہ پائے۔
مشاعرے سے ایک روز قبل وہاں کے اہم انگریزی روزناموں میں اس مشاعرے کے پاکستانی شعراء کی تصویریں اور مکمل کوائف شائع کئے گئے تھے۔ یہ خبر چار پانچ کالم گھیرے ہوئے تھی۔ امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی کے ٹی وی ڈراموں کی تفصیلات اور ہم سب کی تصانیف کا بھرپور تعارف بھی موجود تھا۔ دعوت ناموں کے انوکھے پن اور اس خبر کی اشاعت نے سامعین کے اشتیاق کا گراف بہت اونچا کر رکھا تھا۔
یہ مشاعرہ مسقط کے گلف ہوٹل میں منعقد ہوا۔ گلف ہوٹل کا ایک ہال اس کے لیے بک کرایا گیا تھا۔ اسٹیج بہت ہی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ہال میں تین سو کرسیوں کی گنجائش تھی لیکن سامعین کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تھی۔ اس لیے بہت سے لوگوں کو کھڑے ہو کر محفل کی حاشیہ آرائی کرنی پڑی۔ گویا ہال سامعین سے اس طرح کھچا کھچ بھرا ہوا تھا جیسے اخباروں کے کالم پاکستانی شعراء کے احوال و کوائف سے۔ شعراء کی کل تعداد دس تھی۔ چھ مسقط سے اور چار ہم پاکستانی۔ علی گڑھ کی تنظیم کی نمائندگی کے لیے ان کے شعراء بھی مدعو تھے۔ شعراء کی تعداد محدود اس لیے رکھی گئی تھی تا کہ لوگ مہمان شعراء کو جی بھر کے سنیں اور اس کے باوجود بھی مشاعرہ غیر ضروری طوالت کا شکار نہ ہو پائے۔
اس کے برعکس اب پاکستان میں ایسے بے ہنگم عالمی مشاعروں کا رواج پڑ گیا ہے کہ خدا کی پناہ! ۱۲ بجے سے پہلے ڈنر نہیں ہو پاتا اور پھر مشاعرہ کہیں ایک ڈیڑھ بجے شروع ہوتا ہے۔ بعض شعراء اسٹیج سیکرٹری کو چٹیں بھجوا بھجوا کر اور اپنی مجبوریاں بتا بتا کر شروع میں پڑھ کر اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ سامعین بھی کم ہونے لگتے ہیں اور آخر مشاعرہ (جبکہ سینئر شعراء ابھی باقی رہتے ہیں) 'کوئی ویرانی سے ویرانی ہے' کا منظر پیش کرتا ہے۔ نہ کوئی آدم زاد نہ داد نہ فریاد
پچھلے دنوں کراچی میں ایک عالمی مشاعرہ ہوا تو میری باری اس وقت آئی جب لوگ فجر کی نماز کی قضا بھی پڑھ چکے تھے' سامعین جا چکے تھے اور پنڈال میں دھوپ آ چکی تھی۔ ہندوستان سے آئے ہوئے صنف نظم کے معروف شاعر اختر الایمان صدارت فرما رہے

تھے۔یقین جانئے جب ان کی باری آئی تو پنڈال میں سامعین کے بجائے صرف تکیے اور گدیلے اور چاندنیاں اور دھوپ تھی۔اسٹیج پر چند شاعر بیٹھے تھے جو اونگھتے ہوئے کچھ داد دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس سلسلے میں مسقط کے مشاعرے کے منتظمین نے بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا اور شعراء کی تعداد بہت مناسب رکھی۔سامعین کو بھی اور شعراء کو بھی بوریت سے بچایا۔حسن رضوی اسٹیج سیکرٹری تھے۔مشاعرے کی کمپیئرنگ کے سلسلے میں حسن رضوی اس لیے بہت موزوں ہیں کہ ان کی آواز اس کام کے لیے بہت موزوں ہے۔یہ آواز دوست کی بے جا تعریف نہیں ہے بلکہ واقعتاً ایسا ہے انہیں ناروے میں کمپیئرنگ کے سلسلے میں ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔کمپیئرنگ کے لیے آواز ہی ایک اہم عنصر نہیں بلکہ اس کے لیے بڑی حاضر دماغی اور نکتہ آفرینی اور بذلہ سنجی بھی درکار ہے۔سامعین کی نبض پر کمپیئر کی گرفت ڈھیلی نہیں پڑنی چاہیے اور موقع نزاکت کو بھانپ لینے کی بے پناہ استعداد بھی ضروری ہے۔میں یہ نہیں کہتا کہ حسن رضوی ان سب تقاضوں کو بدرجہ اتم پورا کرتا ہے۔اس کی آواز اساسی عناصر کی حیثیت رکھتی ہے جو بعض فروگذاشتوں کو بھی ڈھانپ لیتی ہے۔

اس بات کا ذکر بھی بہت ضروری ہے کہ اسٹیج اور سامعین کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔اگر یہ فاصلہ زیادہ ہو تو سامعین سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہوتا اور مشاعرہ فلاپ ہو کر رہ جاتا ہے۔مائیک کی خرابی بھی مشاعرے کو خراب کرنے کی صدفی صد ضمانت ہوتی ہے۔لیکن اس مشاعرے میں ان دونوں باتوں کی صحت کا بھرپور اہتمام کیا گیا تھا۔سامعین شعراء کے بہت ہی قریب تھے اور مائیک بھی اے ون۔

◆◆◆

موسمی پیش گوئی

میرے ایک دوست کی اہلیہ ایک انتہائی معروف اور مصروف سماجی ورکر ہیں۔ مجھے ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ حسب تقدیر گھر میں تنہا بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ بیگم صاحبہ کب تشریف لائیں گی تو بے ساختہ کہنے لگے۔ ''انور صاحب! آندھی اور بارش کا کیا پتہ کہ کس وقت آ جائے؟ لیکن لا پتہ چیزوں کا پتہ لگائے بغیر آدمی مطمئن بھی کہاں ہوتا ہے۔ اسے ایک تڑپتا ہوا تجسس عطا ہوا ہے۔

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے

آدمی پر اپنی بے خبری کو باخبری میں بدلنے کی دھن سوار نہ ہوتی تو اس کی علمی فتوحات آج اس مقام پر نہ پہنچتیں۔ آدمی گزری ہوئی صدیوں کی سیر بھی کرنا چاہتا ہے اور مستقبل کے اندر سفر کرنے کا بھی بے انتہا متوالا ہے ورنہ فٹ پاتھ پر طوطے کی چونچ میں راہ گیر کے نصیبوں کے لفافے نہ ہوتے' اخبار میں یہ عنوان کبھی دکھائی نہ دیتا کہ ''آپ کا یہ ہفتہ کیسا گزرے گا'' کف شناسی اور فالگیری کا کوئی وجود نہ ہوتا اور ٹی وی اور ریڈیو پر موسم کی پیش گوئی کی خبریں نشر نہ ہوا کرتیں۔ جب سائنس میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ موسم کی پیش گوئی پورے وثوق سے کی جا سکے تو اس وقت بھی انسان رینگتے جانوروں اور پرندوں کو دیکھ کر موسم کے بدلتے ہوئے تیور سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ دانہ بدہن چیونٹیوں کے لشکر جب اپنے بلوں میں گھسنے لگیں تو یہ کسی طوفان بادو باراں کا اشارہ ہوتا ہے۔ اس کے تجربے نے اسے بتایا کہ مکھیاں جب حد سے زیادہ بھنبھنانے لگیں اور جسم سے چمٹنا اور کاٹنا شروع کر دیں تو یہ بھی موسم کے طوفانی ہو جانے کی نشانی ہوتی ہے۔ پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ جب کسی مقام سے کوچ کرنے لگیں تو یہ بھی موسم میں کسی طوفانی تبدیلی کی علامت ہوتی ہے۔ گلہریاں جب اخروٹوں کی ذخیرہ اندوزی کرنے لگ جائیں تو اس سے بھی آنے والے موسم کی خبر مل جاتی ہے۔ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اگر آپ کسی جگہ مسلسل ۱۴ سیکنڈ تک کسی جھینگر کی ٹک ٹک سنیں اور اس تعداد میں چالیس کا عدد جمع کر دیں تو یہ اس جگہ کا فارن ہائٹ درجہ حرارت ہوگا۔

موسم کی پیش گوئی کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آدمی اس پیش بینی کی بدولت پیش بندی اور حفظ ماتقدم کا اہتمام کر لیتا ہے۔

انگریزی کا یہ محاورہ اسی ضمن میں ہے کہ

Lay by Something for the Rainy Day ________ یعنی "بارش کے دن کے لیے کچھ ذخیرہ اندوزی کر لینی چاہیے۔"

کہا جاتا ہے کہ اگر آپ کڑکتی دھوپ میں کسی شخص کو دیکھیں کہ برساتی اور چھتری کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے تو یقین کر لیجئے کہ وہ محکمہ موسمیات کا کوئی اہلکار ہے۔

کبھی کبھی موسم کا مزاج اتنا بدل جاتا ہے کہ ساری پیش بینیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ یہ شعر اسی تجربے کی پیداوار ہے۔

سخت سردی پڑ رہی تھی مہینہ جون کا
اور لیلیٰ نے پہن رکھا تھا گھگرا اون کا

پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ ماڈرن لیلیٰ محکمہ موسمیات کی ملازمہ ہوگی۔ موسم کی پیش گوئی کا سلسلہ چیونٹیوں اور مکھیوں سے چلا تھا اور اب ماشاء اللہ مشینوں تک پہنچ گیا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی موسمیاتی رصدگاہیں موجود ہیں۔ ان رصدگاہوں میں مقررہ اوقات میں موسمی عناصر کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ یہ مشاہدات دفتر موسمیات کو ارسال کئے جاتے ہیں ان کو موسمی نقشہ جات پر پلاٹ کیا جاتا ہے۔

ماہرین موسمیات ان نقشوں کا تجزیہ کر کے کم دباؤ اور زیادہ دباؤ والے علاقوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس نشاندہی کی روشنی میں بارش، خشکی، نمی اور آندھی وغیرہ کی پیش گوئی کی جاتی ہے۔ اس محکمہ کے افسران کو معلوم ہوتا ہے کہ اب گھٹاؤں کا جمگھٹا کہاں پر ہے اور ان کی سمت سفر کیا ہوگی؟ کہاں کہاں برسیں گی؟ کہاں کہاں ٹھہریں گی؟ اور اب تو روٹھے ہوئے بادل کو منانے اور برسانے کی ترکیبیں بھی ایجاد ہوگئی ہیں اور ایک انتہائی Computerised نظام کے تحت آ چکی ہیں لیکن اس کے باوجود موسم کی آہٹیں کبھی کبھی کمپیوٹر کی دسترس سے باہر ہو جاتی ہیں۔ ہمارے دوست سرفراز شاہد شاعر بھی ہیں اور محکمہ موسمیات کے افسر بھی۔ انہوں نے ایک قطعے میں اپنے محکمے کی کارکردگی کے نتائج پر خود بڑا بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔

معجزہ ہے کبھی جو دفتر میں
کام سائل کا مفت ہو جائے

جیسے اک آدھ بار موسم کی
پیشگوئی درست ہو جائے

اس قطعے کی روشنی میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ موسم کے سارے تیور مشینوں کی گرفت میں نہیں آ سکتے۔ انسان غلطی کا پتلا ہے۔ اس کے بنائے ہوئے کمپیوٹر بھی غلطی کر سکتے ہیں۔ پورا علم غیب صرف خدا کے پاس ہے۔

◆◆◆

گراں فروش

حضرت امیر خسرو نے تو اپنے محبوب کے بارے میں کہا تھا۔

ہر دو عالم قیمت خود گفتہ ای
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

یعنی تو نے دونوں عالم اپنی قیمت بتائی ہے۔ اپنا نرخ اور بڑھا دے کہ ابھی تو ارزاں ہے۔ ہمارے دور میں بازار کی ہر چیز یہ سمجھ بیٹھی ہے کہ خسرو یہ بات میرے بارے میں کہہ گئے ہیں اس لیے ہر جنس کے بھاؤ میں چڑھاؤ ہی چڑھاؤ ہے' اتار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چیزوں کا یہ حال ہے کہ آسمان سے باتیں ہی نہیں کرتیں بلکہ آسمانی چیز بن گئی ہیں۔ عوام کی قوت خرید ایک سسکتی ہوئی نارسائی بن چکی ہے۔ اب غم دوراں کے ذیل میں ہماری غزل میں اس ہوشربا گرانی کا ذکر ہونے لگا ہے۔ کسی شاعر نے اس دکھ کو کس شدت سے محسوس کیا ہے۔

بچے کا ہاتھ جا نہ سکا آسمان پر
گویا مہ و نجوم سجے تھے دکان پر

یہ گرانی تو ایسی ہے کہ چاند کے حوالے سے بھی پورے طور پر بیان نہیں ہو سکتی اس لیے کہ چاند تو صرف چودہ دنوں تک بڑھتا ہے اور پھر کم ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن ہم تو ایسی کوئی چیز دیکھی نہ سنی جس کے دام ایک دفعہ بڑھ جائیں اور پھر کم ہو جائیں۔ بکرے کے گوشت کا نرخ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے پہاڑ کی بلندی تک پہنچ گیا ہے۔

گوالوں کی آنکھوں کا پانی ایسا مر گیا ہے کہ منہ سے کہتے ہیں کہ پندرہ' بیس یا کہ دس والا۔ کسی نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ پانی ملا دودھ اعلانیہ بکے گا اور گاہک خریدنے پر مجبور ہوگا۔ بس یہی مجبوری ہی تو ہے کہ گراں فروش جس کا بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے۔ ابھی پچھلے ماہ رمضان کی بات ہے کہ منڈی میں کھجوریں پانچ روپے کلو بک رہی تھیں اور محلے کی دکان پر پانچ روپے پاؤ اور وہ بھی انتہائی ناقص۔

گراں فروش آج کل چاندی نہیں سونا بنانے کی فکر میں ہے اسی لیے مہنگائی کے ایسے ایسے مظاہرے دیکھنے میں آتے ہیں کہ کچھ

پلے نہیں پڑتا کہ اس کا جواز کیا ہے۔ آخر یہ اصول اقتصاد کیسے سمجھ میں آئے کہ گرمیاں آتی ہیں تو انڈے اور مہنگے ہو جاتے ہیں۔ چاہیے تو یہ کہ زرعی اور صنعتی اجناس زیادہ سے زیادہ پیدا کی جائیں لیکن کاروباری طبقہ اور صنعت کار یہ چاہتے ہیں کہ صرف ایک ہی چیز پیدا کی جائے' طلب اور وہ بھی مصنوعی۔ طلب بڑھ جائے تو مال کی جو قیمت چاہے وصول کرو۔ اس سلسلے میں وہ ابجد کے سارے حروف بھلا بیٹھے ہیں انہیں تو صرف ایک ہی حرف یاد ہے کہ ذال سے ذخیرہ' اسمگلر اور ذخیرہ اندوز کے اعمال متضاد ہیں۔ ایک چیزوں کے انبار بیرون ملک دھکیل دیتا ہے اور دوسرا اندرون ملک جمع کر لیتا ہے اور نتیجہ دونوں کا ایک ہی کہ گاہک جیب میں پیسے ڈال کر پھرتے رہتے ہیں اور مارکیٹ میں مطلوبہ جنس دکھائی نہیں دیتی اور اگر دکھائی دے تو ہاتھ اس تک پہنچ نہیں پاتے۔

ایک زمانہ تھا کہ گاہک بھری ہوئی جیب لے کر جاتا تھا تو بازار سے چیزوں کا تھیلا بھر کر ضرور لے آتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ کہ روپوں کا تھیلا بھر کر لے جائے تو پھر بھی خریداری کے بعد اس تھیلے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ ایک خریدار وہ بھی ہے جس کی جیب میں رقم جیب کے رقبے سے زیادہ ہے۔ جب یہ صاحب بازار کا رخ کرتے ہیں تو ان کا خرام ناز گراں فروش کو گراں فروشی پر اور بھی دلیر بنا دیتا ہے۔

یہ درست ہے کہ مہنگائی اور گراں فروشی کی اور بھی کئی وجوہات ہیں۔ تیل کی قیمتوں میں اضافہ' فیشن پرستی بھی' ظاہر داری بھی' قرضوں کی ادائیگی بھی' خسارے کی سرمایہ کاری بھی' برآمدات کی کثرت بھی اور افراط زر بھی لیکن یہ سب مادی اسباب ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور بنیادی سبب صرف اور صرف انسان کی خود غرضی ہے۔ راتوں رات قارون بن جانے کی ہوس ہے۔ رزق کے بارے میں آنے والے کل کا خوف ہے۔

منافع خوری نفسیاتی بیماریوں میں سے ایک مہلک مرض ہے۔ سونے کی ہوس دراصل روح کا یرقان ہے اور اس کا علاج صرف اللہ کا خوف ہے جو باقی سارے خوف ختم کر دیتا ہے اور انسان کے اندر دوسرے انسانوں کے لیے دردمندی پیدا کرتا ہے۔ کسی گراں فروش اور منافع خور سے پوچھا جائے کہ آخر تو کس لیے اتنی دولت جمع کر رہا ہے تو دھن کی دھن اس پر اس قدر سوار ہے کہ اس کے پاس اس سوال کا جواب دینے کی فرصت بھی نہیں' حالانکہ

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

◆◆◆

مالک مکان

ذرا سی بھول سے بے دخلی ہوگئی ورنہ ہم سے بڑی جائیداد والا کون ہوتا۔ شومئی قسمت سے دانہ گندم والا مرحلہ درپیش آ گیا ورنہ ہم توفردوس بریں کے صاحب میراث تھے۔ ابلیس کے بہکاوے میں آ جانے کی ایسی سزا ملی کہ طوبیٰ کی ٹھنڈی چھاؤں' دودھ اور شہد کی نہروں اور زمردیں محلات کی مخملی تکیہ گاہوں سے اس طرح باہر نکال دیئے گئے کہ رضوان سے لڑائی کی نوبت بھی نہ آئی۔ مقدر نے جنت سے زمین پر دے مارا اور پھر۔۔۔۔۔۔۔ نہ کہیں جہاں میں اماں ملی' جو اماں ملی تو کہاں ملی۔۔۔۔۔۔۔ کرائے کے ایک مکان میں۔ اور توبہ توبہ! کرائے کا مکان بھی ایسا جڑواں کہ نیچے کی منزل میں مالک مکان اور اوپر کی منزل میں ہم۔ اللہ اللہ' آسمان سے گرے تھے کھجور میں اٹکے ہوئے ہیں اور کرنی کا پھل کھا رہے ہیں۔ ہماری اس حالت زار کا تھوڑا سا اندازہ امتحان کا وہ امیدوار کر سکتا ہے جس کے سر پر نگران (Invigilator) کھڑا ہو۔ خدا لگتی کہئے' کیا اس امیدوار کے اوسان بجا رہ سکتے ہیں؟ اس کے حافظہ کا تو بس اللہ ہی حافظ ہے۔

مالک مکان کی ہمسائیگی ایک ایسا وحشت ناک تجربہ ہے جس کی اذیت صرف کرایہ دار ہی جان سکتا ہے۔ کھانا پینا زندگی کی بنیادی نعمتیں ہیں۔ لیکن ہم سے پوچھیے۔ لطف کھانے میں ہے باقی نہ مزا پینے میں۔

اب ذرا خیال فرمایئے سردیوں کا موسم ہے' آدمی کا جی چاہتا ہے کہ ڈرائی فروٹ سے بھی استفادہ کرے۔ بڑے شوق سے گھر میں بادام لا کر رکھے ہوئے ہیں۔ ایک روز ایک عدد بادام توڑنے کی کوشش کی تھی۔ مالک مکان کی گرجدار آواز سارے محلے میں گونج گئی۔ "یہ اوپر کیا فوجی مشقیں ہو رہی ہیں؟ یہ مکان ہے' پانی پت کا میدان نہیں ہے۔" موصوف کی آواز میں احساس ملکیت کا طنطنہ ایسا لگتا تھا جیسے جنگل کا شیر گونج رہا ہے کچھار میں۔ وہ دن اور یہ دن ہم نے کبھی بادام توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ حسرت سے باداموں کو دیکھ لیا کرتے تھے اور دل کو یوں تسلی دے رکھی ہے کہ انگور کھٹے ہیں تو بادام بھی تو کڑوے ہو سکتے ہیں۔

پڑوس میں مالک مکان کا پڑاؤ اتنا ہی اذیت ناک ہے جیسے کوئی سخت گیر معالج ہر وقت مریض کے ساتھ رہے اور اپنی ہدایات کی مسلسل یلغار سے اس کا ناک میں دم کر دے۔ مالک مکان کی طرف سے نسخہ ترکیب استعمال مکان اور اس سلسلے میں پرہیز کے جملہ قواعد کی گردان ہمہ وقت جاری رہتی ہے۔ سیڑھیوں سے گزرو تو یوں گزرو' فرش پر چلو تو یوں چلو' بچوں کو واضح ہدایت ہے کہ شور نہ کریں'

کسی درو دیوار پر الف انار اور ب بادام لکھنے کی بھی سخت پابندی ہے۔ بوڑھوں پر کھانسنے کی قدغن۔ مرچ مصالحہ کوٹنا ممنوع ہے اور مہمانوں کے لیے ایسی کڑوی کڑوی ہدایات ہیں کہ جب کبھی ہمیں شرف میزبانی حاصل ہوتا ہے تو جان سولی پر لٹکی ہوتی ہے۔ ذہن پر ایک ایسی گھٹن طاری ہو جاتی ہے کہ ہم بے چارے مہمان کے لیے ایک حرف بشاش بھی افورڈ نہیں کر سکتے۔

ہمیں ہر وقت احساس رہتا ہے کہ ہمارا فرش دراصل مالک مکان کی چھت ہے لہٰذا یہاں پر چلنے پھرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس لیے کہ صاحب مکان ایسی نازک مزاج ہستی ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔دل کی دھڑکن سے بھی وہ شوخ خفا ہوتا ہے۔ اس لیے ہم نے فرش پر اس طرح چلنا سیکھ لیا ہے جسے اصطلاح میں دبے پاؤں کہتے ہیں اس احتیاط کے باوصف ایک روز بے تکلفی کے عالم میں ہماری آواز یا کچھ گستاخ ہو گئی تھی کہ فوراً جواب طلبی ہوئی کہ یہ کیا کھٹ کھٹ لگا رکھی ہے' مکان کی چھت ہے کوئی بازی گاہ نہیں ہے۔ ہم سے بھی اس موقع پر نہ رہا گیا اور بڑی للکار کے ساتھ اقبال کا یہ شعر پڑھ دیا۔

شاید کہ زمیں ہے یہ کسی اور جہاں کی
تو جس کو سمجھتا ہے فلک اپنے جہاں کا

ارشاد ہوا کہ یہاں شعر و شاعری اور اردوئے معلیٰ نہیں چلے گی' آپ کوئی اور گھر ڈھونڈ لیجیے۔

اب یہ ایک ایسا کاری وار ہے جس کا فوری تو کیا برسوں تک کرایہ دار سے جواب نہیں بن پڑتا۔

یہی تو بات ہے جو کرایہ دار کو پانی پانی کر جاتی ہے لیکن جہاں تک اصلی پانی ہے وہ اوپر والے کرایہ دار کو نصیب ہو جائے تو اس کی بلند بختی ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ہمارے یہاں پانی کا نل اوپر تک جاتا ہے لیکن مالک مکان کے افراد خانہ چونکہ نیچے والی ٹونٹی کے ارباب بست و کشاد ہیں اور اپنے لیے پانی کو اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنی کہ مچھلیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اوپر والوں کو ہوائی مخلوق سمجھا جاتا ہے اس لیے نیچے کی ٹونٹی اس وقت بند کی جاتی ہے جب آکسیجن اور ہائیڈروجن میں پھوٹ پڑ جاتی ہے اور انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب پانی ہوا میں تبدیل ہو چکا ہے اور اب اس کی سپلائی ہوائی مخلوق کو ہونی چاہیے۔

کرائے کی گاڑیوں کے میٹر ہوتے ہیں لیکن مالک مکان کے الحاق کرایہ دار کو کسی قسم کا میٹر لگانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ پانی کا میٹر نیچے' سوئی گیس کا میٹر نیچے۔۔۔۔۔۔اور جب بل آتے ہیں تو سیدھے اوپر بھیج دیے جاتے ہیں۔

ہمیں اس مکان میں رہتے ہوئے تقریباً پانچ چھ سال ہو گئے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اوپر کی منزل پر سفیدی بھی کرا دی گئی تھی لیکن اس کے بعد اب تک یہ واقعہ دہرایا نہیں گیا۔ شاید اس لیے کہ دھوپ اور چاندنی میں جھلملاتی ہوئی بالائی منزل کو آسمان کی نظر

نہ لگ جائے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کا رنگ مکان کی تاریخ تعمیر سے لے کر اب تک نیچرل چلا آ رہا ہے۔ آخر دروازے اور کھڑکیاں ہی تو ہیں کوئی آسمان تو نہیں جو رنگ بدلتا رہے۔ دیواروں کے اوپر چھت کے نیچے کئی حصے خالی چھوڑ دیے گئے ہیں۔ مالک مکان کا اصرار ہے کہ ہم انہیں روشن دار سمجھیں۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ صاحب مکان کو کرایہ دار سے بڑی ہمدردی کا دورہ پڑنا شروع ہو جاتا ہے۔ ایک ایسے ہی عالم میں ایک روز ہمارے مالک مکان ہمارے ہاں تشریف لائے اور دیر تک بڑی محبت بھری باتیں کرتے رہے۔

"دیکھئے نا۔۔۔۔۔۔ ہم آپ تو اس مکان میں بھائیوں کی طرح رہ رہے ہیں' ہم نے کبھی فرق نہیں رکھا۔ آپ کے ہاں کسی کو کھانسی ہو تو مجھے اپنے گلے میں پھانس چبھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خدانخواستہ آپ کو بخار چڑھ جائے تو مجھے دردسر شروع ہو جاتا ہے۔"

غرضیکہ مالک مکان ہمارے بیمار نہ ہونے کے باوجود دیر تک ہماری عیادت کرتے رہے اور جاتے ہوئے صرف اتنی بات بڑی تاکید سے کہہ گئے کہ "بھائی آج کل پراپرٹی ٹیکس والوں نے بڑا تنگ کر رکھا ہے' اگر ان کا کوئی آدمی آپ سے پوچھے کہ آپ کتنا کرایہ ادا کرتے ہیں تو کہہ دیجئے گا کہ تین سو روپے مہینہ دیتے ہیں۔ دیکھئے نا ذرا آپس کی بات ہے۔ اچھا اب آپ آرام فرمائیے' میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ"

ان تمام سہولتوں کے ساتھ ہر ماہ یہ تقاضا ہوتا ہے کہ مہنگائی بہت ہو گئی ہے آپ مہربانی کر کے اس مہینے کرایہ بڑھا دیجئے' ہمیں تو اس سے دگنے پیسے ملتے ہیں۔

مالک مکان صرف یہی سمجھتا ہے کہ مہنگائی کرایہ وصول کرنے والے کے لیے ہوتی ہے کرایہ ادا کرنے والے کے لیے نہیں ہوتی۔

ہمارے ایک دوست ایک ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہیں۔ وہ بھی ایسے ہی کرب ہمسائیگی کے ستم رسیدہ ہیں کبھی بڑے ہنس مکھ ہوا کرتے تھے اور صحت بڑی قابل رشک تھی۔ اب یہ عالم ہے کہ تفکرات نے چہرے پر بیش از وقت لہریے پیدا کر دیے ہیں۔

ان کے پاس بیٹھ جائیے تو وقفہ بہ وقفہ ایک آہ سرد کھینچتے ہیں اور بڑے فریادی لہجے میں صرف اتنا کہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ یا میرے مالک مکان!

بسکہ دشوار ہے سفر کرنا

پرانے زمانے میں گھر سے باہر قدم رکھنا اور سفر کرنا کتنا مشکل کام تھا۔ آج کے زمانے میں سفر کی اس صعوبت کو سہولت میں بدلنے کے لیے کیا کیا ایجادات نہیں ہوئیں۔ برسوں کے سفر دنوں میں اور کئی دنوں کے سفر چند ساعتوں میں طے ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات تو برسوں کا سفر لمحوں میں طے ہو جاتا ہے اسی لیے تو شاعر نے کہا ہے۔

اک زخمی شدید دم مرگ کہہ گیا
وقت اس کے پاس گرچہ بہت ہی قلیل تھا
بس پر سوار ہو کے میں فارغ ہوا شتاب
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

اس دور میں سب سے زیادہ حیرت کی بات یہی ہے کہ انسان کے پاس عبرت حاصل کرنے کی فرصت بھی نہیں ہے۔ بسوں اور لاریوں کی کارگزاریوں سے پوری طرح آگاہ ہونے کے باوجود لوگ بس پر سوار ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ آخر ہم بھی تو انسان ہیں اور خطا کے پتلے ہیں۔ ذوق سفر میں ایک ایسی بس پر سوار ہو گئے جس پر F-16 لکھا ہوا تھا۔ یہ بجا ہے کہ لاہور سے راولپنڈی تک اس بس نے کسی دوسری بس سے معانقہ نہیں کیا' کسی ٹرک سے بغل گیر نہیں ہوئی البتہ وقفہ بہ وقفہ ایسے لمحے ضرور آتے رہے کہ کلیجہ منہ کو آتا رہا۔

بس کی سیڑھیوں پر سوار ہوتے ہی نظر اوپر اٹھائی تو ہاتھ پر ایسا رعشہ طاری ہوا کہ اٹیچی کیس پر قابو نہ رہ سکا اور ایک بار گراں پاؤں پر آ گرا۔ اس لیے کہ سامنے لکھا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔ سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں۔۔۔۔۔۔۔ سیٹ ہمیں ایسی فراہم کی گئی تھی جہاں پر بیٹھ کر دو سواریاں ایک دوسرے کی پشت پناہی کرتی ہیں' یعنی اوزاروں والا ڈبہ' جہاں سے ہمیں بوقت ضرورت بار ہا اٹھایا اور بٹھایا گیا۔ ہماری دائیں طرف کی دیوار پر کھڑکیوں کے اوپر ایک شعر اور کچھ انتباہی جملے اس ترتیب سے لکھے ہوئے تھے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو اگر کچھ مرتبہ چاہیے
جسم کا کوئی حصہ گاڑی سے باہر مت نکالیں

کہ دانہ خاک میں مل کر گل وگلزار ہوتا ہے

آدھی سواری کو سیٹ نہیں ملے گی

سب سے زیادہ جلی قلم میں ایک ایسا ہیبت ناک جملہ تحریر تھا جو شاید کسی بیمہ کمپنی کے تعاون سے لکھوایا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔

"سفر سے پہلے اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔۔۔۔۔۔۔کیا خبر یہ تیری زندگی کا آخری سفر ہو"

ہماری بائیں طرف ایک ہم سفر استاد امام دین کے شعری اسلوب کی مکمل ترجمانی کر رہے تھے۔یعنی نسوار بھی کھاتے جاتے تھے اور لعاب دہن بھی پھینکتے جاتے تھے نال نال۔بس میں سواریاں لادی نہیں بلکہ ٹھونسی گئی تھیں۔انجن سٹارٹ ہوا تو ساتھ ٹیپ ریکارڈر بھی آخری حد تک اونچی آواز میں کھول دیا گیا اور گوش خراش گیتوں کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔میں نے اس نامعقول حملے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی کوشش کی لیکن اس نقار خانے میں خود میرے کان میری آواز کو ترس گئے اور میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس ٹیپ ریکارڈر کی صور اسرافیل کے ساتھ کوئی قریبی عزیز داری ہوگی۔

ایسی بسوں میں ٹکٹ اس لیے جلدی کاٹ دیا جاتا ہے کہ مسافر کے لیے بس چھوڑ کر بھاگنے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔اور ہمارے لیے یہ گنجائش یوں بھی باقی نہیں تھی کہ سو روپے کا نوٹ کنڈکٹر کے حوالے کر چکے تھے اور بقایا ٹکٹ پر لکھ دیا گیا تھا۔اس مرحلے کے بعد بھرے جہان میں ہمیں صرف ایک کاغذی پرزہ یاد رہ گیا تھا اور باقی سب کچھ حافظے سے محو ہو چکا تھا۔راستے میں کنڈکٹر سے جہاں کہیں بھی بقایا کا مطالبہ کیا' یہی ارشاد ہوا کہ ہم کوئی بھاگے جا رہے ہیں حالانکہ بس بڑی تیزی سے بھاگ رہی تھی۔بس اچانک ایک سٹاپ پر رکی تو میری یہ حالت کہ پان کا ایک برگ سبز خریدنے کی توفیق بھی نہیں تھی اس لیے کہ میری کل پونجی ہندسوں کی صورت میں ٹکٹ پر لکھی تھی۔کسی کو کھاتے پیتے کون دیکھ سکتا ہے۔میں نے لاری سے اتر کر یہ کام بھی کیا۔بقائے کے خیال نے ایسا بدحواس کر رکھا تھا کہ واپسی پر دوسری لاری پر سوار ہوتے ہوتے بچا۔بھلا ہو میرے ہم سفر کا کہ وہ مجھے اصلی لاری کی طرف لے گیا۔بھوک اور پیاس لے کر لاری سے باہر نکلا تھا' انہی چیزوں کے سمیت پھر اپنی سیٹ پر آ دھنسا۔

سردی شدید تھی اور کھڑکیوں کے صرف آدھے شیشے سلامت تھے اور بس کی مست کاری کا یہ عالم تھا کہ

میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

جہاں بریک لگائی گئی اس فوریت کے ساتھ لگائی گئی کہ مسافر مسافر کا منہ چومنے لگا۔ہر مقام سے ہر قسم کی سواری بھرتی کی گئی۔ بھیڑ کا یہ عالم کہ حجابات من وتو اٹھ گئے تھے۔کسی مسافر کی اپنی ذاتی باقی نہیں رہی تھی۔یہی احساس ہوتا تھا کہ تو میں ہے اور میں تو

ہوں۔اندریں حالات بس نے طبیعت بھی ایسی پائی تھی کہ چلتا ہے تو رکنے کا نام نہیں لیتا اور کہیں رکتا ہے تو چلنے کا نام نہیں لیتا۔اس توقف آمیز ترتیب سے پانچ گھنٹوں کا سفر ساڑھے آٹھ گھنٹوں میں طے ہوا۔

بس جس وقت اپنے سٹاپ پر رکی تو سارے مسافر پیادہ ہو گئے لیکن میری حالت جلسے کے اس سامع کی سی تھی جس کا کمبل اسٹیج پر بچھا تھا۔مجھے میرا کمبل نہیں چھوڑ رہا تھا اور میرا کمبل میرے بقائے کی رقم تھی۔

میرا تجربہ تھا کہ مسافر بس میں بیٹھ کر ایسا بے بس ہوتا ہے کہ بس کچھ نہ پوچھئے۔۔۔۔۔۔مضمون کا پہلا جملہ دہرانے کی معذرت چاہتا ہوں۔

پرانے زمانے میں گھر سے باہر قدم رکھنا اور سفر کرنا کتنا مشکل کام تھا' لیکن آج بھی کون سا آسان ہے۔کسی بس میں بیٹھ کر دیکھ لیجئے۔۔۔۔۔۔ہزار ہا ستم روزگار راہ میں ہے۔

نام بدلنے سے تقدیر بدل جاتی ہے

انسان کی سب سے بڑی پہچان اس کا نام ہے۔اسی لیے تو کہا گیا ہے کہ نام رکھنے میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔بعض لوگ اپنا نام تبدیل بھی کر لیتے ہیں۔اس لیے ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ نام بدلنے سے تقدیر بدل جاتی ہے۔نام کے بارے میں بڑے بڑے نامور شعراء نے بڑے بڑے خوبصورت شعر لکھے ہیں۔جوش ملیح آبادی کہتے ہیں۔

نام پوچھا تو کچھ اس طرح بتایا اس نے
جس طرح کوئی خزانے کا پتہ دیتا ہے

نام ہی کے حوالے سے ریاض خیرآبادی نے اپنی شوخ بیانی سے کتنا دلچسپ مضمون پیدا کیا ہے۔

جب کہہ کے ریاض اس نے سر بزم پکارا
بن بن کے کئی لوگ مرے نام کے اٹھے

ڈاکٹر محمد دین تاثیر کا بڑا معروف شعر ہے' جس میں نام بتانے کی بجائے چھپانے پر زور ہے۔

داور حشر مرا نامہ اعمال نہ پوچھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

اور غالب کا یہ شعر تو غالب کے نام کی طرح مشہور ہے۔

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

جس طرح بعض خطوط بے معنی لکھے جاتے ہیں اسی طرح بعض ناموں کا بھی کچھ مطلب نہیں ہوتا۔صرف لفظ کی صوتی زیبائش پیش نظر ہوتی ہے۔اسی لیے کئی ایسے نام دار بھی ملتے ہیں جن کو اپنے نام کے مفہوم سے قطعی کوئی آگاہی نہیں ہوتی۔
جس چیز کا وجود ہے اس کا نام بھی ہے۔سوائے دو چیزوں کے۔ایک تو مشہور پرندہ ہما ہے کہ نام تو رکھتا ہے لیکن موجود نہیں اور دوسرا اسم جس کا کوئی مسمی نہیں اور ہر ادارے کے ہر دفتر میں اس کا وجود فرض کر لیا گیا ہے۔اس ہستی ناموجود کو Dealing کلرک

کے نام سے پکارتے ہیں۔

ایک بڑے معتبر ادبی حوالے سے یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ نام میں کیا رکھا ہے؟ نا بھئی نا' ناموں میں بہت کچھ رکھا ہوتا ہے۔ ناموں کے مفاہیم کے حوالے سے تو پوری کائنات کی سیر ہو جاتی ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا نام سنتے ہی آدمی ہوائی تخت پر بیٹھ جاتا ہے اور ملک سبا تک گھوم پھر آتا ہے۔

ہمارے یہاں کئی ناموں میں بڑے بڑے مظاہر فطرت' نظام شمسی کے سیارے اور موسمی اثرات تک موجود ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر فطرت' قدرت' آفتاب' ماہتاب' شفق' نور' زہرہ' قمر' سحر' بہار' شبنم اور شمیم وغیرہ۔ اسی طرح کئی ایک ناموں نے کئی ایک پھولوں' پودوں اور درختوں کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ سرو' صنوبر' شمشاد اور حنا اسی قبیل کے نام ہیں۔ باغوں اور پھولوں سے تو اس ضمن میں اتنا استفادہ کیا گیا ہے کہ جس کا احاطہ ممکن نہیں مثلاً گلزار' گل اندام' گلفام' لالہ رخ' ریاض' بوستان' گلبدن' بیگم' نرگس' سنبل' نسرین' یاسمین اور نیلوفر وغیرہ۔

ان گنت نام ایسے ہیں کہ مروت اور محنت میں گندھے ہوئے ہیں' جن کے سابقے یا لاحقے' مہر' الطاف' کرم' عنایت اور ان کے بہت سے مترادفات ہیں۔ ایسے ناموں میں جمال ہی جمال پایا جاتا ہے۔ بعض ناموں سے حد درجہ کی کسر نفسی ٹپکتی ہے۔ مثال کے طور پر سائل' فقیر' درویش' مسکین' اور حلیم وغیرہ۔

کئی نام ایسے پرندوں اور حیوانوں سے ماخوذ ہیں جن میں بڑا جلال و جبروت پایا جاتا ہے اور بہادری اور شجاعت کا اظہار ہوتا ہے۔ شاہین' شہباز' ضیغم' اسد اور شیر اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ابن انشاء قلمی نام ہے' اس کا اصلی نام کچھ اور تھا جس کا ذکر اس نے کبھی مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے کہ اس کے بقول اس کے اصلی نام میں ایک چوپائے کا نام شامل ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب اس راز سے پردہ اٹھا دینا چاہیے کہ وہ چوپایہ بھی جنگل کا بادشاہ ہے۔

اسی طرح کئی نام ایسے ہیں جن میں اسلحے سے استفادہ کیا جاتا ہے' جیسے تیغ علی' سیف الدین اور شمشیر حسین وغیرہ۔

ایسے ناموں کے سلسلے میں مجھے یہ خیال آیا کہ پرانا اسلحہ تو اب صرف گھروں اور عجائب گھروں کی زینت ہو کر رہ گیا ہے اور میدان جنگ میں استعمال ہونے کی بجائے صرف ڈرانگ روم کی آرائش کے کام آتا ہے لہٰذا متروک اسلحے کی بجائے اس جدید دور میں جدید اسلحے کی مدد سے جدید نام ایجاد ہونے چاہئیں اور موجودہ آلات حرب و ضرب سے استفادہ کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

معمولی غور و فکر سے جو چند ایک نام میرے ذہن میں آئے ہیں' قارئین تک پہنچا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ ان

ناموں سے Inspire ہو کر ان سے بہتر نام تجویز کر سکیں۔ میری یہ کوشش تو بس ابتدائی کوشش ہے۔

گولی کی رعایت سے بلٹ النساء بیگم مجھے بڑا موزوں نام محسوس ہوا۔ اسی طرح پسٹل پروین بھی بڑا خوش آہنگ لگتا ہے۔ میگزین بٹ (بندوق والا) بھی خاصا لڑاکا نام ہے۔ اس ضمن میں ایک مردانہ اور نہایت عمدہ نام میزائل الدولہ ذہن میں آتا ہے۔ ملک اسکڈ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ راڈار خان نہایت اچھوتا اور دبنگ معلوم ہوتا ہے۔ ریوالور جان بھی بڑا جاندار نام ہے۔ اسی طرح بندوق بیگ المتخلص بہ کلاشنکوف کسی ماڈرن شاعر کا بھرپور نام ہو سکتا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بدلتے ہوئے زمانے کا ساتھ دینے کے لیے جدید تقاضوں کے مطابق ہمیں اپنے ناموں کو نظر ثانی کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ اس لیے کہ انسانی ترقی کا راز تازہ کاری ہی میں پوشیدہ ہے اور اس میں کوئی دشواری بھی نہیں۔ اس لیے کہ روزِ ازل ہی سے آدم کو سارے نام سکھا دیئے گئے تھے۔

◆◆◆

بھاگم بھاگ

آج انسان تیز رفتار گاڑیوں پر اس لیے سوار ہوتا ہے کہ خود اس پر تیز رفتاری کا بھوت سوار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ریس (Race) کی ''ریس'' نے زندگی کی کشتی کو طوفانی ہچکولوں کے حوالے کر دیا ہے اسی لیے شاعر کو اس دور کے موسیقاروں کو یہ ہنگامی مشورہ دینا پڑا کہ ساز کی لے تیز کرو' محبوب عاشق سے پہلے بھی گریزاں تھا مگر اب تو سپر سانک ہو گیا ہے۔

مری صدا سے بھی رفتار تیز تھی اس کی
مجھے گلہ بھی نہیں ہے جو وہ رکا بھی نہیں

تمدن کی رہگذر پر پتھر سے پلاسٹک تک سفر کرنے والے مسافر نے گدھے کی زین سے ایک دم ایسی ہائی جمپ لگائی ہے کہ راکٹ میں آن بیٹھا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز برق رفتار ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ لوک لٹریچر اور شعروادب کو بھی ایڑ لگ گئی ہے اور دھڑا دھڑ مال تیار ہو رہا ہے۔

پچھلے زمانے کی پہیلیاں بھی اور سہیلیاں بھی بڑی ساکت اور جامد قسم کی ہوتی تھیں اب ان پہیلیوں کا مواد بھی متحرک ہو گیا۔ ملاحظہ کیجئے۔

ہے ایک چیز تیز میں اک چیز تیز تر
موج خرام یار سے بڑھ کر کہیں جسے

پہلی تو شے وہی ہے کہ ٹیکسی ہے جس کا نام
اور دوسری وہ چیز کہ میٹر کہیں جسے

اگر سوال یہ کیا جائے کہ اس دور کی روح عصر کو مختصر طور پر بیان کیجئے تو جواب صرف اور صرف سرعت رفتار ہے اور یہ تیز رفتاری وبا کی طرح پھیل رہی ہے۔ زندگی کا Tempo جتنا فاسٹ ہو گیا ہے اس کا دائرہ اتنا ہی Vast ہو گیا ہے۔ گاڑی گاڑی کو اور آدمی آدمی کو بے تحاشا اوورٹیک کئے جا رہے ہیں اور برسوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہو رہے ہیں۔

اک زخمی شدید دم مرگ کہہ گیا
وقت اس کے پاس گرچہ بہت ہی قلیل تھا
بس پر سوار ہو کے میں فارغ ہوا شتاب
ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا

اگر گہرے غور وفکر کے ساتھ نگاہ کو بھی شامل کر لیجیے تو اس تیز رفتاری کے پیچھے بے صبری کا بھیانک چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ دوسرے جہان کئی سال پہلے پہنچنے سے کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ بندہ یہاں کے کسی اسٹیشن پر چار پانچ منٹ دیر سے پہنچ جائے۔ ان دنوں ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ اسے کہیں سے جادو کی چھڑی مل جائے' کوئی ایسا منتر میسر آ جائے جس سے سب کچھ فوری طور پر ہو جائے۔ خواہشوں کے پیڑ پل بھر میں ہرے بھرے ہو جائیں۔ آدمی راتوں رات امیر ہو جائے حالانکہ یہ سب کچھ غیر فطری ہے۔ زندگی اپنی حقیقت میں ایسی نہیں ہے۔ لہو کو دودھ میں تبدیل ہونے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے ایسا لگتا ہے کہ زندگی کے سر سے صبر کا سایہ اٹھ گیا ہے اور وہ کسی یتیم بچے کی طرح بوکھلائی ہوئی بھاگے چلی جا رہی ہے۔

انگریزی کا کتنا سچا محاورہ ہے کہ "Hurry Spoils Curry" یعنی شتاب زدگی کھیر کا دلیہ بنا دیتی ہے۔ بہت زیادہ تیز رفتاری سراسر خسارے کا سودا ہے۔ کوئی چیز بھی جب اپنی حد رفتار سے بڑھتی ہے تو بڑی پر خطر ہو جاتی ہے۔ ہوا ذرا تند ہو جائے تو آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ پانی کی رفتار زیادہ تیز ہو جائے تو سیل بے پناہ بن جاتا ہے۔ جھونکا بگولا ہو جاتا ہے اور آدمی کا جب یہ حال ہو جائے کہ۔۔۔۔۔۔۔ میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے۔۔۔۔۔۔ تو وہ بھی دیوانہ ہو جاتا ہے۔ تیز رفتاری کے ہاتھوں آج کل آدمی پر اسی جنون کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ تماشا یہ ہوا کہ مشینیں بناتے بناتے آدمی خود مشین بن گیا ہے۔

کسی کو سونٹھ کی ایک گرہ مل گئی' پنساری بن بیٹھا۔ آدمی کو جب سے پہیہ مل گیا ہے اس پہیے نے اسے بڑے چکر میں ڈال دیا ہے۔ سمجھنے لگا ہے کہ اب عنان دو عالم اس کے ہاتھ میں ہے۔ حالانکہ اس کا پہیہ محروم توازن ہو گیا ہے۔ پہیہ بالکل جام ہو جائے تو یہ بھی بری بات ہے اتنا تند خرام ہو جائے کہ جھومنے اور ڈولنے لگے تو یہ مدہوشی اور بھی زیادہ بری بات ہے۔ یہ درست ہے اگلے وقتوں میں کارکردگی کی رفتار بھی بڑی سست ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں کی بات ہے کہ

کسی کفش دوز کو کسی ضرورت مند نے جوتا بنوانے کے لیے اپنا ناپ بھی دیا اور پیشگی کے طور پر ایک روپے کی رقم بھی۔ موچی گاہک کو برابر چکمہ دیتا رہا اور اس کا وعدہ ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ گاہک نے ایک روز یہ کہا ہے کہ جب میں نے جوتے کا آرڈر دیا اس

وقت کنوارا تھا' اب میرا ایک پانچ سال کا لڑکا ہے اس کے لیے ہی بنا دو۔ کفش دوز نے پھر وعدہ کر لیا اور اس کے وعدہ فردا کا تسلسل حسب سابق برقرار رہا۔ کچھ سالوں بعد گاہک بڑے غصے میں آ کر کفش دوز سے یہ کہنے لگا کہ اب میرے اس بیٹے کی شادی ہونے والی ہے اب تو اس کے لیے جوتا بنا دو۔ کفش دوز نے اپنی گرہ سے ایک روپیہ نکال کر زمین پر دے مارا اور بڑے غضب ناک لہجے میں کہنے لگا کہ "تمہیں اتنی ہی جلدی ہے تو اپنا بیعانہ واپس لے جاؤ۔"

بخدا ہم اس کاہلی اور سست روی کی تلقین نہیں کرتے صرف اتنی گزارش ہے کہ آدمی اتنا سست بھی نہ ہو کہ پا بہ گل ہو جائے اور نہ اتنا تیز رفتار ہو کہ پاگل ہو جائے اس لیے کہ افراط سے پیا جائے تو آب حیات بھی زہر بن جاتا ہے۔ سائنسی اعتبار سے روشنی کی رفتار حاصل کرنے کی خواہش دراصل معدوم ہو جانے کی خواہش ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ سرعت رفتار کسی بڑے حادثے میں بدل جائے۔ ہمارا وجود عدم کے حوالے نہ ہو جائے۔

جس کی لاٹھی...... اس کی بھینس

تمہاری بھینس کیسے ہے کہ جب لاٹھی ہماری ہے
اب اس لاٹھی کی زد میں جو بھی آئے سو ہمارا ہے
مذمت کاریوں سے تم ہمارا کیا بگاڑو گے؟
تمہارے ووٹ کیا ہوتے ہیں جب ویٹو ہمارا ہے

صدیوں کے تجربے سے حاصل شدہ دانش جب چند لفظوں میں انڈیل دی جائے تو ضرب المثل کہلاتی ہے۔ ایسے جملوں کو دانائی کی گٹھڑیاں بھی کہا جا سکتا ہے۔ کسی زبان کے یہ مظاہر اتنے ہی معتبر ہوتے ہیں جتنی سائنس کی وہ سچائیاں جنھیں قوانین علمی یعنی Scientific Laws کہا جاتا ہے۔ یہ جملے ایسے کیپسول ہیں جن میں سماجی مشاہدات کے نتائج کے نچوڑ کو بند کر دیا گیا ہے۔ نفسیات اور عمرانیات کے طلبہ اگر صرف انہیں گٹھڑیوں میں جھانک لیں تو حضرت انسان کے انفرادی اور اجتماعی رویوں کی پوری روداد مرتب کی جاسکتی ہے۔

اردو زبان کے پاس ضرب الامثال کا کتنا ذخیرہ ہوگا؟ یہ سوال کمپیوٹر سے متعلق ہے البتہ ضرب المثل کا صحیح ترین اطلاق اسی ایک مثل پر ہوتا ہے کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" اس لیے کہ لاٹھی اور ضرب لازم و ملزوم ہیں۔ لاٹھی کا کام ہی ضرب لگانا ہے۔ لاٹھی والے کے سامنے جو بھی آ جائے وہ لٹھ مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کسی کی بھینس کو دے مارے تو کوئی پوچھنے والا نہیں کہ میری بھینس کے ڈنڈا کیوں مارا۔ بھینس بیچاری تو رہی ایک طرف وہ تو عقل کے پیچھے بھی لٹھ لیے پھرے گا اور عقل کی کیا مجال کہ لاٹھیاں کھا کے بے مزہ ہو جائے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ ضرب الامثال میں بڑی حکمتیں پوشیدہ ہو جاتی ہیں۔ جی ہاں' یہ مثال بھی بہت بڑی حقیقت کی ہے اس میں بھینس درماندگی اور بیچارگی کی تجسیم ہے اور لاٹھی قوت کا Symbol ________ ہر طرح کی قوت۔ کوئی بھی زمان و مکان ہو۔ ماضی بعید ہو' ماضی قریب ہو' زمانہ حال ہو' فضا ہو' صحرا ہو' دریا ہو' ہر کہیں ایسا لگتا ہے جیسے ساری سچائیاں لاٹھی پر لکھی ہوئی ہیں۔ دیکھنے میں یہی آیا ہے کہ قوت ہی کلید کامرانی ہے۔ ساری بازیاں زور والے ہی جیتے جاتے ہیں۔ میر صاحب نے بھی تو یہی کہا تھا۔

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میر
کس بھروسے پہ آشنائی کی

میرے صاحب نے زوروزر کو ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے اس لیے کہ زر بھی تو ایک زبردست لاٹھی ہے جو مصنف کے پاس نہیں ہوتی پبلشر کے پاس ہوتی ہے' عام صارفین کے پاس نہیں ہوتی' آڑھتیوں اور ذخیرہ اندوزوں کے پاس ہوتی ہے۔ وہ اس کے زور سے قیمتوں اور نرخوں کو آگے ہی ہانکے چلے جاتے ہیں۔ قوت کے نشے میں جھومتا ہوا ظالم اپنی بربریت کا جواز پیدا کرنے کے لیے بہانے بھی ایسے تراشتا ہے جو صحت رفتار سے عاری معلوم ہوتے ہیں' جھومتے' لڑکھڑاتے اور لنگڑاتے ہوئے۔ ندی کے نشیب میں پانی پیتے ہوئے میمنے کو بلندی پر پانی نوش جان کرتے ہوئے بھیڑیے نے یہی تو کہا تھا کہ تم میرے پانی کو گدلا کیوں کر رہے ہو؟ اس لیے کہ میمنے کو دیکھ کر اس کی پانی کی پیاس بجھ گئی تھی اور لہو کی پیاس بھڑک اٹھی تھی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بے قصور ہو کر بھی میمنہ قصوروار ٹھہرا تھا۔ اس کے بعد بھیڑیے نے خونخوار لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔ ''تم نے پچھلے برس مجھے گالی کیوں دی تھی؟'' آپ کی یادداشت میری تائید کرے گی۔ میمنے نے عرض کیا تھا۔ ''حضور! میں تو اس وقت معرض وجود میں ہی نہیں آیا تھا۔' میمنے کی اس عرض و گزارش کے بعد بھیڑیے نے اس پر صرف ایک اور الزام لگایا تھا کہ وہ تمہارا بھائی ہوگا اور اس کے بعد قصہ اس طرح اختتام کو پہنچا تھا کہ بھیڑیے نے زبان کا استعمال چھوڑ کر دانتوں کا استعمال شروع کر دیا تھا۔

جس طرح مایا کے کئی نام ہیں اسی طرح لاٹھی کے بھی کئی نام ہیں۔ اس مشہور کہانی میں لاٹھی کا نام بھیڑیا ہے اور لاٹھی تو ہر دور میں اپنا نام بدلتی رہتی ہے اس وقت اس کا بین الاقوامی سائنسی نام ایٹم بم ہے اور سیاسی نام ''ویٹو'' ہے جس کے پاس یہ لاٹھی ہے سب کچھ اسی کا ہے۔ وہ دھڑلے سے کہہ سکتے ہیں کہ

ہر بھینس بھینس ماست کہ لاٹھی بدست ماست

اس لاٹھی نے شہروں کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا ہے۔ لاٹھی والوں کی موجودگی میں کسی اور کا کوئی حق باقی نہیں رہتا۔ وہ ہر بے بس و بے کس کو چیلنج کر سکتے ہیں۔

لاٹھی والے کی ایک ریت یہ بھی ہے کہ جس جرم کا مرتکب خود ہوتا ہے وہی الزام دوسروں کے سر تھوپ دیتا ہے۔ دوسروں کے گھر میں گھس کر یہ کہنے لگتا ہے کہ میں بیرونی مداخلت روکنے کے لیے آیا ہوں۔ یہ بہانہ اس کے ضمیر کا کچوکا ہے۔ تحفظ فراہم کرنے کے نام پر آ دھمکنے والے جنگی طیارے بیچاری فاختہ سے اس طرح نبرد آزما ہوئے کہ پورا افغانستان ''فغانستان'' بن کر رہ گیا۔ ایک لاٹھی

والے کے مقابلے میں بہت سی افرادی قوت بے بس و مجبور ہے۔ اسی مشاہدے کے پیش نظر پنجابی میں کہا گیا ہے کہ "چور تے لاٹھی دو جنے' تے میں تے چاچا کلے"

جنوبی افریقہ میں یہی تو ہو رہا ہے کہ گورے گنتی کے ہیں اور کالے ان گنت ہیں۔ لیکن لاٹھی گورے ہاتھوں میں ہے لہٰذا ہر مشک فام تختۂ مشق ہے۔ گوری اقلیت کی اس بیداد پر ساری دنیا بے قرار ہے لیکن یہ بے قراری کسی داد تک نہیں پہنچتی' زیادہ سے زیادہ قرارداد تک پہنچ جاتی ہے۔ یو این او ایسی کئی قراردادوں کو گود میں لیے بیٹھی ہے اور پیار کر رہی ہے۔ حفاظتی کونسل کی ذمہ داری یہی تو ہے کہ وہ اس طرح کی قراردادوں کی دل و جان سے حفاظت کرتی ہے اور وہاں سے کبھی باہر نہیں نکلنے دیتی۔ باہر نکلنے کی اور دوسروں کے علاقوں میں دندنانے کی اجازت تو صرف اسی کو ہے جس کے قبضے میں لاٹھی ہے اور فرنگ کی رگ جاں بھی۔ وہی اسرائیل جس کا نام انگریزی تلفظ میں زیادہ اسم با مسمیٰ معلوم ہوتا ہے یعنی "عزرائیل"

ماضی اور حال کے احوال کا تجربہ اور مطالعہ یہی ثابت کرتا ہے کہ بالعموم لاٹھی والا انسانیت کے درپئے آزار ہے لیکن یہ بھی یاد رہے کہ مردم آزاری جابروں کا معمول ضرور ہے لیکن انسانی سرشت کو قبول ہرگز نہیں ہے۔ انسانی فطرت کو اس سے الرجی ہے اور عالمی ضمیر اس کا باغی ہے اور اس لاٹھی کو توڑنے کے درپے ہے۔ اخلاق اور انصاف کا تقاضا ہے کہ یہ بدکردار لاٹھی ٹوٹے۔ وہ دن روز سعید ہوگا جب سماعتیں اس شکست کی آواز سنیں گی۔

"لڈو ونڈ دی گلی وچوں نکلاں

تے شالا تیری ڈانگ ٹٹ جائے"

قوت فی نفسہ بری چیز نہیں۔ دوسروں کی بھینس پر قبضہ جمانے اور دوسروں پر دھونس جمانے کے لیے ہو تو لاٹھی فتنہ ہے۔ اپنے ریوڑ کی رکھوالی کے لیے ہو تو نعمت ہے۔

موجودہ زمانے میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا اصول بڑا مقبول ہے۔ لیکن جب بہت بڑی ایمرجنسی پیدا ہوتی ہے اور فرعونوں کی لاٹھیاں زیادہ ناہنجار ہونے لگتی ہیں تو پردۂ غیب سے بہت بڑی لاٹھی نمودار ہوتی ہے کہ کون ہے یہ گستاخ! تاخ' تڑاخ! یہ وہی عصائے کلیمی ہے جو رنگ سنگ سے پانی نکالتا ہے اور سنگدلوں کو پانی میں ڈبو دیتا ہے۔ اس دور میں روس کا انجام سب کے سامنے ہے۔ موجودہ صورت حال کے پیش نظر ایسا لگتا ہے کہ اب امریکہ کی باری ہے۔ ڈرنا چاہیے اس ذات سے جس کی لاٹھی بے آواز ہے۔

◆◆◆

ملاقاتی

زندگی میں حسن اتفاق کے تجربے بھی ہوتے رہے ہیں اور سوء اتفاق کے بھی اور یوں لگتا ہے کہ سوئے اتفاق کا پلڑا بھاری ہے۔
عموماً ایسا ہوتا ہے کہ آپ جس کا انتظار کر رہے ہوں وہ تو آتا نہیں لیکن جس کا انتظار نہ کر رہے ہوں' وہ چانک آ دھمکتا ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آپ کو اس طرف کی اومنی بس فوری طور پر میسر آ جائے جس طرف آپ کو جانا ہو۔۔۔۔۔۔لیکن ایسا ضرور ہوتا ہے کہ جس طرف جانا نہیں ہوتا اس طرف کی بسیں آتی چلی جاتی ہیں۔
یہ مسئلہ ماہرین نفسیات سے متعلق ہے کہ نفس انسانی میں جو کھٹکے اور دھڑکے پیدا ہوتے ہیں وہ حقیقت کا روپ کیوں دھار لیتے ہیں۔ بہر حال ایسا ہو کے رہتا ہے کہ جب مریض کی آنکھ لگ جائے تو عیادت کرنے والے عین اسی وقت تشریف لاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیتے جی اس ظلم سے مفر نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں نے اس صورت حال کے بارے میں کافی سخت لفظ استعمال کیا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ ظلم کی تعریف ہی یہی کی گئی ہے کہ کوئی چیز بے موقع محل اور بے محل ہو تو وہ ظلم کے زمرے میں آتی ہے۔
اس ضمن میں ہمارے ساتھ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ خریداری سے ایک بیزاری سی پیدا ہو گئی ہے۔ اس الرجی کا باعث پہلی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں خریداری کے لیے وقت نکالنا کوئی آسان بات ہے؟ اور پھر مہنگائی کے ہاتھوں دکان آسمان کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ ہمارے ہاتھوں میں اتنی سکت کہاں کہ ستارے توڑ لائیں۔ چلیے جگر کے شعری روشنی میں اس بات پر بھی سمجھوتہ ہو سکتا ہے کہ

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن

اس لیے ہم خریداری کا ارادہ اسی وقت کرتے ہیں جب باورچی خانہ پوری طرح قحط زدہ علاقہ قرار پا جاتا ہے اور بیگم یہ اعلان کر دیتی ہیں کہ نمک' مرچ' مسالہ اور آٹا دال ایک دم ختم ہیں۔ لہٰذا ناچار ہم بیگم کو خریداری کی مہم کے ارادے سے آگاہ کرتے ہیں اور جب شاپنگ کا ارادہ ابتدائی کروٹیں لے رہا ہوتا ہے اور بیگم تیار ہو کر تھیلا ڈھونڈ رہی ہوتی ہیں اور ہم بوٹوں کے تسمے باندھ رہے ہوتے ہیں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دروازے پر کوئی نہ کوئی دھپ دھپ اور دستکیں سنائی دینے لگتی ہیں۔ بچے خبر لاتے ہیں کہ ابو کوئی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔ لیجیے منتظر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ ہم انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہیں اور اپنے اوپر جبراً خیر مقدم

کا تاثر طاری کرتے ہیں۔ منتظر صاحب ہمیں تیاری کی حالت دیکھ کر فرماتے ہیں۔ ''اچھا تو آپ ابھی ابھی باہر تشریف لائے ہیں۔ مجال ہے کہ ایک لمحے کے لیے ان کے ذہن شریف میں یہ خیال آئے کہ اگر کوئی تیار بیٹھا ہے تو اس کا یہی مطلب تو نہیں کہ وہ ابھی ابھی باہر سے آیا ہے ممکن ہے کہ وہ باہر جانے کے لیے تیار ہوا ہو۔

ارشاد ہوتا ہے۔ ''اس روز میں حاضر نہ ہو سکا کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانی پڑی جس کے لیے میں معذرت چاہتا ہوں اور آج اسی عذر خواہی کے جذبے کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ اتنے میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ منتظر صاحب سے ایک لمحے کی معذرت کر کے اندر جاتا ہوں تو اطلاع ملتی ہے کہ تھیلا مل گیا ہے اور اب جلدی کیجئے۔ یہ صاحب کس وقت آ گئے ہیں ان سے اجازت لینے میں مزید تاخیر نہ کیجئے۔ واپس ڈرائنگ روم میں پہنچا تو منتظر صاحب کو پوری طرح آمادۂ گفتار پایا۔ ہر چند کہ ان کی ہر بات کا جواب اتنا مختصر دیتا ہوں کہ ہوں ہاں سے آگے جملے کو بڑھنے نہیں دیتا۔ لیکن میرے اس تکلمی اشارے کو بھانپ لینے کے کوئی آثار ان کے ہاں دکھائی نہیں دیتے۔ میں نے رسمی طور پر دریافت کیا کہ چائے تو چلے گی؟ مجھے امید تھی وہ کہیں گے کہ نہیں بھئی' چائے نہیں چلے گی' میں خود چلوں گا۔۔۔۔۔۔۔ لیکن میری توقع کے برعکس ارشاد ہوا۔ ''کیوں نہیں' چائے کے بغیر گفتگو اور گفتگو کے بغیر چائے میں لطف پیدا نہیں ہوتا۔ ضرور پئیں گے۔'' اس کے بعد منتظر صاحب دیر تک چائے کا اور گفتگو کا لطف اٹھاتے رہے اور جب رخصت ہوئے تو ہمارا عزم خریداری دم توڑ چکا تھا۔ بسا اوقات مہربانوں کی ایسی بروقت تشریف آوری نے ہمیں گھر سے باہر قدم رکھنے نہیں دیا۔ غالب نے شاید ایسی ہی کسی صورت حال کے پیش نظر یہ شعر کہا ہوگا۔

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے ہم

کبھی اس دام سے جلدی رہائی ہو گئی ہے اور بازار میں جا پہنچے ہیں تو جان پہچان والوں نے وہاں بھی جان نہیں چھوڑی۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ میں بسلسلہ شاپنگ بازار میں جنس مطلوب کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ میرے پیچھے پیچھے میری بیگم بھی آ رہی تھیں۔ اتنے میں ایک صاحب دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ ''مسعود صاحب! ذرا رکئے' آج آپ کو دفتر میں بڑے فون کئے لیکن آپ کہاں تھے؟ یار کبھی فون پر بھی مل جایا کرو۔ رضوی صاحب کو آپ سے بڑا ضروری کام تھا۔ کئی دنوں سے آپ کی تلاش میں ہیں۔ آج آپ کے گھر آنے کا ارادہ رکھتے تھے وہ اس وقت آپ کی طرف ہی گئے ہوں گے اور آپ ادھر پھر رہے ہیں۔ ذرا سڑک سے ادھر ہو جائیے۔ میں نے بے قصور ہونے کے باوجود بڑی زوردار معذرت کی اور بات ختم کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ میرے پیچھے

میری بیگم کے قدم بھی رکے ہوئے ہیں۔ میرے سارے وجود پر ایک بدحواسی طاری ہے اور ان کا سلسلہ کلام رکنے میں نہیں آتا۔ آخر میں ارشاد ہوا۔ ''کیا خیال ہے اس وقت کسی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے نہ پی جائے؟ مجھے یوں لگا جیسے چائے کی گرم گرم پیالی انہوں نے میرے اوپر انڈیل دی ہے۔

میں نے عرض کیا کہ اس وقت آپ کی بھابی میرے ہمراہ ہیں اور ذرا شاپنگ کا ارادہ ہے۔ یہ سن کر انہیں بالآخر موقع کی نزاکت کا کچھ احساس ہوا اور آئی ایم سوری کہہ کر کہیں ہجوم میں گم ہو گئے۔ تھوڑی دور آگے گئے ہوں گے کہ ایک اور صاحب نے میرا راستہ روک لیا اور بڑے دبنگ لہجے میں السلام علیکم کہا۔ میں ابھی وعلیکم السلام بھی نہیں کہہ پایا تھا کہ وہ بے ساختہ بغل گیر ہو گئے اور دیر تک مجھے اپنے پرخلوص شکنجے میں جکڑے رکھا۔ جدا ہوئے تو مجھے سراسیمہ دیکھ کر فرمانے لگے۔ ''آپ نے ہمیں ابھی تک نہیں پہچانا؟''

میں نے عرض کیا۔ ''جی' کوشش کر رہا ہوں۔''

ارشاد ہوا۔ ''آپ ہمیں جان بوجھ کر سرپرائز دے رہے ہیں' بھئی میں نادر ہوں۔ ریل کار میں آپ سے ملاقات ہوئی تھی' پچھلے سال کی بات ہے۔ آپ لاہور جا رہے تھے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ ۲۵ نمبر سیٹ پر بیٹھے تھے۔''

میں نے اپنی اور ان کی خفت مٹاتے ہوئے عرض کیا۔ ''جی ہاں' مجھے بالکل یاد آ گیا۔'' حالانکہ مجھے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم سفری کی ساری گفتگو دہرائیں اور میں اور میرے پیچھے میری بیگم دونوں گم سم کھڑے تھے۔۔۔۔۔۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔۔۔۔۔۔ بہرحال کسی طرح ان سے جان چھڑا کر ہم کپڑے کی ایک دکان میں داخل ہو گئے۔ بیگم نے ایک تھان کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے مشورہ لیا کہ سوٹ کے لیے یہ کیسا رہے گا؟ میں ابھی جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ ایک بچہ میری طرف دوڑتا ہوا آیا کہ ایک صاحب آپ کو باہر بلا رہے ہیں۔ بیگم سے یہ کہہ کر کہ ''ابھی آتا ہوں'' میں باہر کی طرف بھاگا۔ دکان کی سیڑھیوں سے اترا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی نے اپنے دونوں ہاتھ میری آنکھوں سے چپکا دیئے اور کانوں نے یہ سنا کہ بوجھو تو جانیں۔ اب فیملی کے ساتھ شاپنگ نکلا ہوا شخص تو اس پوزیشن میں بھی کہاں ہوتا ہے کہ دیکھتی آنکھوں سے کسی کو پہچان سکے' چہ جائیکہ اس کی آنکھیں میچ کر اس سے اپنی شخصیت دریافت کرائی جائے۔ دکاندار ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ بیگم صاحبہ ہمارا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ ہم سر بازار ہیں اور سخت بیزار ہیں اور دوسروں کو اٹھکیلیاں سوجھی ہیں۔ اس نادیدہ مہربان کی شناسائی کا مرحلہ بڑی مشکلوں سے طے ہوا۔ صورت حال کی مکمل وضاحت کے بغیر ان کے چنگل سے رہائی کی کوئی صورت نہیں تھی۔

◆◆◆

شاعر اور شجر

درخت سے انسان کا قدیمی رابطہ ہے بلکہ ایک شجر ممنوعہ کے پھل کو چکھنے کے جرم کی پاداش میں ہی تو آدم زاد کو سورج کے گرد گھومتی ہوئی ایک بہت بڑی مٹی کی گیند پر پھینک دیا گیا کہ اب ایک مدت تک اس مٹی میں اس پودے کو اگاتے اور کھاتے رہو اور چکھنے کا چسکا پڑ ہی گیا ہے تو یہاں کے سرد و گرم بھی چکھو۔

دانہ گندم کے کھانے کی سزا اچھی ہے
مارے مارے پھر رہا ہے دانے دانے کے لیے

شجر ممنوعہ کے چھو لینے سے ہی زمین پر انسانی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے اور اب درخت کے ساتھ انسان کی دوستی ایسی ہے کہ اس کے بغیر سانس لینا بھی محال ہے۔

شاعر تو شروع سے ہی پیڑوں کی خوش منظری کے اسیر چلے آ رہے ہیں۔ تشبیہی اور استعاراتی عمل سے شعراء نے پیڑوں اور انسانوں کے درمیان بڑے خوبصورت رابطے اور قربتیں تلاش کی ہیں۔ پیڑوں کا ''حسن'' ان کے سمٹتے پھیلتے سائے اور ان کے پتوں' پھولوں اور پھلوں کی مہک ہر دور اور ہر علاقے کی شاعری میں رچی ہوئی ہے۔

اردو اور فارسی غزل میں درختوں کے حوالے سے کار آشیاں بندی کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ محبوب کی خوش قامتی کے تذکرے کے لیے سرو شمشاد و صنوبر کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ غالب نے کیا خوب کہا ہے۔

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے

اردو کی جدید غزل میں اس تشبیہ کے تیور دیکھئے۔

سرخ پوشاک میں قامت اس کی
سرو کو آگ لگی ہو جیسے

پورے وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور کی اردو غزل میں محبوب ترین اور توانا ترین علامت درخت' پیڑ اور شجر ہی تو ہے۔

یہاں تک کہ شاعری کے جدید مجموعوں کے نام مثلاً شاخ تنہا' صد برگ اور جنگل رات وغیرہ بھی اسی رابطہ کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اس صنعتی دور میں نباتی زندگی کو جو خطرات لاحق ہیں شاید اسی کے ردعمل میں شعراء نے انسان کو عین شجر قرار دے لیا ہے اور اس علامت کے حوالے سے اپنے سارے دکھ سکھ بیان کیے ہیں۔ ہماری غزل میں اب یہ علامت اتنی وسعت کی حامل ہو چکی ہے کہ انسانی زندگی کے جملہ مسائل پر محیط ہے۔

شکیب جلالی جدید اردو غزل گو شعراء میں بڑا نمایاں اور معتبر نام ہے۔ اس نے غزل کو ایک نیا لہجہ اور ایک نیا موڑ دیا ہے۔ امیجز کی قدرت' احساس کی شدت اور جذبے کی حدت نے اس کی غزل میں عجیب تاثر پیدا کر دیا ہے۔ وہ غزل میں ایک نیا موڑ اس لیے بھی ہے کہ درخت کا استعارہ بھرپور اور وسیع معنویت کے لحاظ سے پہلی مرتبہ اسی کے ہاں استعمال ہوا ہے۔

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

اک یاد ہے کہ دامن دل چھوڑتی نہیں
اک بیل ہے کہ لپٹی ہوئی ہے شجر کے ساتھ

نہ اتنی تیز چلے سر پھری ہوا سے کہو
شجر پہ ایک ہی پتا دکھائی دیتا ہے

اور شکیب کی زندگی کی آخری غزل کا مطلع ملاحظہ کیجیے۔

گلے ملا نہ کبھی چاند بخت ایسا تھا
ہرا بھرا بدن اپنا درخت ایسا تھا

اس ضمن میں خاقان خاور خاص طور پر ایک ایسا شاعر ہے جس کی شاعری کی ساری امیجری اور پیکر تراشی نباتی زندگی سے ماخوذ ہے۔ اس کی شاعری ایسی ہے جیسے ۔۔۔۔۔۔ اک پیڑ سر راہ کھڑا سوچ رہا ہے۔ والد بزرگوار کی شفقتوں سے محروم ہو جانے کے

سانحے کو اس نے اس علامت سے اتنی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کا یہ شعر ایک مثال بن گیا ہے۔

سارے جہاں کی دھوپ مرے گھر میں آ گئی
سایہ تھا جس درخت کا مجھ پر وہ کٹ گیا

ارض وطن میں آزار مفلسی کے بیان میں بھی اس نے پودوں کا سہارا لیا ہے۔

میلوں میں پھیلتے گئے پودے کپاس کے
محتاج کتنے جسم ہیں پھر بھی لباس کے

خورشید رضوی نے صنوبر کو قامت محبوب کے لیے نہیں بلکہ رومانی یادوں کے تلازمے کے طور پر استعمال کیا ہے۔

تو نے اپنے ہاتھ سے کھودا تھا جس پر میرا نام
وہ صنوبر ہے لہلہاتا لب جو آج بھی

رزق کی تلاش میں دیہاتوں سے آئے ہوئے مزدور آج کل جس طرح کارخانوں کی چمنیوں کے دھوئیں کا رزق اور مشینوں کا ایندھن بنتے ہیں اس لیے پر اپنا ایک شعر بھی سناتا چلوں۔

دھواں دھواں ہے درخت کی داستاں انور
کہ جنگلوں میں پلے اور بستیوں میں جلے

اخبار میں ایک خبر چھپی تھی کہ ایک خاتون نے جب بے آبرو ہونے کا خطرہ محسوس کیا تو اپنے جسم پر تیل چھڑک کر اور آگ لگا کر جان دے دی لیکن اپنی عصمت کو داغدار نہیں ہونے دیا۔ اس شعر کے پس منظر میں یہی واقعہ دکھائی دیتا ہے۔

اکتا کے ہوسناک نگاہوں کے ستم سے
اک پیڑ نے شعلوں سے بدن ڈھانپ لیا ہے

ہمارے زمانے میں ظلم کی آندھیوں نے جس طرح لوگوں کو اپنا وطن چھوڑنے پر مجبور کیا ہے اور وہ ہجرتوں کی جانگسل صعوبتوں کا شکار ہوئے ہیں محیط اسمٰعیل کا یہ شعر اس سانحے کی بھرپور ترجمانی کر رہا ہے۔

التجا کرتی رہیں سب ٹہنیاں
زرد پتوں کا نہ ٹھیرا کارواں

پروین شاکر کے شعری مجموعہ ''صد برگ'' کے پہلے شعر کی آغوش میں یہی استعارہ ہمک رہا ہے۔

جلا دیا شجر جاں کہ سبز بخت نہ تھا
کسی بھی رت میں ہرا ہو یہ وہ درخت نہ تھا

قدرت نے پیڑوں میں جو دف و ربط کی خو رکھ دی ہے' ضمیر جعفری صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے۔

پیڑوں کی آواز سنو
پتوں میں اکتارے ہیں

مجید امجد اس دور کا اتنا بڑا شاعر ہے کہ بعض سخن شناسوں کے نزدیک وہ اقبال کے بعد اردو کا سب سے بڑا شاعر ہے اور اس کی ''شب رفتہ'' اس دور کا شعری صحیفہ ہے۔ بنیادی طور پر وہ نظم کا شاعر ہے۔ اس نے جدید نظم میں تجربوں کے انبار لگا دیے ہیں۔ لفظوں کی موسیقی' حسن تخیل اور بے پناہ دردمندی نے اس کے یہاں عجیب طلسم پیدا کر دیا ہے۔ اس کی نظموں میں سبزہ زاروں اور سہانی ہریاول کی ایسی سج دھج دکھائی دیتی ہے۔ جو صرف اسی کا حصہ ہے۔ اس کے یہاں جھومتے پیڑ' گنے کی کیاریاں' درختوں کے مخملی سبز سائبان' ان کی چھاؤں کی ٹکڑیاں' لانبی لانبی دوب' ہری بھری فصلیں' جھکتے ڈنٹھل' پکتے ہالے' دھوپ رچے کھلیان' پیڑوں کے جھرمٹوں میں چہکتے پنچھیوں کی ڈاریں اور اس طرح کے سینکڑوں دلکش منظر دکھائی دیتے ہیں۔

پیڑوں سے مجید امجد کو جو محبت ہے اس کی جھلک دیکھنے کے لیے اس کا یہی ایک شعر کافی ہے۔

اس جلتی دھوپ میں یہ گھنے سایہ دار پیڑ
میں اپنی زندگی انہیں دے دوں جو بن پڑے

درختوں میں جو منفعت رسانی ہے۔ مجید نے اس شعر میں اسے کتنی قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مجید کے نزدیک یہی وہ صفت ہے جس سے کسی کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ اپنی نظم ''توسیع شہر'' میں اس نے درختوں کے کٹنے کے دکھ کو اس طرح محسوس کیا ہے جس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے قتل اشجار پر اس نے ایک نوحہ تحریر کیا ہے۔

گھنے سہانے' چھاؤں چھڑکتے' بور لدے چھتنار
بیس ہزار میں بک گئے سارے ہرے بھرے اشجار
جن کی سانس کا ہر جھونکا تھا ایک عجیب طلسم

قاتل تیشے چیر گئے ان ساونتوں کے جسم
کٹتے ہیکل، جھڑتے پنجر، چھٹتے برگ و بار
سہمی دھوپ کے زرد کفن میں لاشوں کے انبار

◆◆◆

ملاوٹ

ہمارے انفرادی اور اجتماعی رویوں میں محبوبیت کا عنصر روز بروز بڑھتا چلا جارہا ہے۔محبوب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا

ہمارا بھی تو یہی حال ہے۔جمعہ کا خطبہ سنتے ہیں' ریڈیو اور ٹی وی کے اصلاحی مذہبی اور اخلاقی پروگرام ہم باقاعدہ دیکھتے اور سماعت فرماتے ہیں۔ٹی وی پر ''فرمان الٰہی'' دیکھے بغیر تو ہم سو بھی نہیں سکتے۔اخباروں میں بڑے بڑے اخلاق آموز مضامین ہم ضرور پڑھتے ہیں لیکن ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ اس دیکھنے' پڑھنے اور سننے کا کوئی اثر قبول نہیں کرنا۔ہم پر کوئی نصیحت کارگر نہیں ہوتی۔ہمیں سمجھانے کی ہر کاوش ایسی ہے جیسے گیند پر اخروٹ ٹھہرانے کی کوشش کی جائے۔استاد شاگردوں سے سارا سال کہتا رہے گا کہ کلاس روم میں کتاب لے کر آؤ لیکن طلبہ سارا سال اس نصیحت پر عمل نہیں کرتے لیکن امتحان کے روز کمرۂ امتحان میں ضرور ساتھ لے جاتے ہیں۔ہم نے لاپروائی کی ایسی ادائیں سیکھ لی ہیں اور بے حسی کے ایسے انداز اپنا لیے ہیں کہ جیسے ہم قدرت کے بڑے چہیتے ہیں۔ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔۔۔۔۔۔کوئی کچھ بھی کر لے ہم جوں کے توں رہتے ہیں یعنی ہمارے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ہمارے بے حسی کا عالم یہ ہے کہ

اس وقت وہاں کون دھواں دیکھنے جائے
اخبار میں پڑھ لیں گے کہاں آگ لگی تھی

اور یہ تو صرف ایک دو اداؤں کا تذکرہ ہے۔۔۔۔۔۔ہزار ایسی ادائیں ہیں جن کا نام نہیں۔ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ وعدے پورے کیا کرو لیکن محبوبوں کی طرح ہمیں وعدۂ فردا کا تسلسل بہت عزیز ہے۔ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وعدہ صرف کرنے کے لیے ہوتا ہے پورا کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔

معاشرے میں رہتے ہوئے ہم معاشرے سے کٹے رہتے ہیں۔معاشرے کے پاس برائیاں ہیں تو ہمارے پاس بے اعتنائیاں ہیں۔ہوٹلوں اور تنوروں پر مدتوں سے جس آٹے کی روٹی بک رہی اس میں سے سارے مفید اجزاء بڑے دھڑلے سے نکال دیئے جاتے ہیں اور باقی صرف ربڑ رہ جاتا ہے اور ذرا سوکھ جائے تو روٹی لکڑی بن جاتی ہے۔ہم بڑے خلوص کے ساتھ یہ ربڑ اور لکڑی کھائے اور چبائے چلے جا رہے ہیں۔ہم یہی سوچتے ہیں کہ آخر ہمیں اس سے کیا مطلب۔یہ تو حکومت کا فرض ہے اور اگر ہم یہ سوچتے

بھی ہیں تو یہ سوچ کر چپ ہو جاتے ہیں کہ آدھ پاؤ کی روٹی اب مشکل سے چھٹانک بھر رہ گئی ہے' اس میں مٹی ہو' ریت ہو' جوار ہو' کچھ ہو اتنی سی مقدار بھلا کسی کو کیا نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اتنی معمولی سی باتوں پر کڑھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو آٹے میں نمک کے برابر ہے۔

ہمیں معلوم ہے کہ ملاوٹ ہمارے معاشرے کے ساتھ اس طرح لپٹی ہوئی ہے جیسے درخت کے ساتھ آکاس بیل لپٹ جاتی ہے اور اس کے مساموں سے روئیدگی کی ساری صلاحیت چھین لیتی ہے۔ یہ خطرناک رجحان ہمیں گھن کی طرح کھا رہا ہے اور جونک کی طرح پلتا چلا جا رہا ہے۔ بقول غالب ہم نے اپنے آپ کو اپنا غیر سمجھ رکھا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے ساتھ نہیں کسی اور کے ساتھ ہو رہا ہے۔ معاشرے کے آئینے میں ہم اپنی صورت کو اپنی صورت ماننے کے لیے تیار ہی نہیں جیسا کہ شاعر کہتا ہے۔

حیرت ہے کہ جب آئینہ میں دیکھتا ہوں
بوڑھا سا کوئی اور نظر آتا ہے

خالص دیسی گھی اب ایک ایسا اسم ہے جس کا مسمیٰ کہیں نہیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ چیز ہما اور عنقا کی صف میں شامل ہو گئی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے اگر اس کی کچھ شیشیاں بھر کر کسی عجائب گھر میں رکھ دی جاتیں تو آئندہ نسلیں اسے دیکھنے اور سونگھنے کی سعادت سے محروم نہ رہتیں۔

دودھ کی یہ صورت حال ہوتی جا رہی ہے۔

آؤ اس کے اصل گورے رنگ سے
اب تصور میں ملاقاتیں کریں
آؤ پھر ماضی کی یادیں چھیڑ دیں
آؤ خالص دودھ کی باتیں کریں

جمعہ بازار اور اس کی ساری اولاد یعنی اتوار بازار یا منگل بازار۔۔۔۔۔۔۔ کہیں بھی چلے جایئے انڈوں میں گندے انڈے ضرور شامل ہوں گے۔ صحت مند آلوؤں میں 75% گلے سڑے آلو ضرور ملیں گے۔ تھوڑے سے اچھے پیازوں میں کثرت سے ایسے پیاز ضرور ملائے ہوں گے جیسے رستے ہوئے ناسور ہوں حالانکہ بازار کا نگران عملہ وہاں پر باقاعدہ موجود ہوتا ہے۔

آمیزش کی ایک بڑی شاعرانہ صورت پیدا ہو گئی ہے کہ جس چیز کو جس چیز سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ان دونوں کو آپس میں ملا دیا

جاتا ہے یعنی مشبہ اور مشبہ بہ کو یکجان کر دیا جاتا ہے۔اس اتحاد کو تجارتی وحدت الوجود بھی کہا جا سکتا ہے۔مثلاً کھاد کی شکل چینی سے بہت ملتی ہے لہٰذا ان دونوں کا ملاپ کرا دیا جاتا ہے۔چنے کا چھلکا چائے کی پتی سے مشابہ ہوتا ہے لہٰذا ان کا مکانی بعد بھی ختم کر دیا جاتا ہے۔پسی ہوئی اینٹیں ،پسی ہوئی مرچوں کی مانند لگتی ہیں۔ان کو بھی آپس میں اس طرح گڈ مڈ کر دیا جاتا ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔تا کس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری۔۔۔۔۔۔۔گھی اور گریس کا آپس میں مل جانا تو اور بھی آسان ہے ان میں سے ایک اور قدرت مشترک بھی ہے کہ دونوں ''گ'' سے شروع ہوتے ہیں۔

تاجروں نے طے کر رکھا ہے کہ وہ اس اسلوب آمیزش سے افزائش امراض شکم کرتے رہیں گے۔وہ اپنے ان تجربوں پر نازاں ہیں کہ معمولی سی آمیزش سے غیر معمولی منافع حاصل کیا جا سکتا ہے۔وہ اپنی اس ہنر مندی پر پھولے چلے جا رہے ہیں۔ان کا ماٹو ہے۔

کام کرنا ہے تو پھر کیجئے ذرا ترکیب سے
کچھ نہ کچھ ہر بات میں درکار ہے ذوق ہنر
صرف تھوڑا سا ملاوٹ کا قرینہ چاہیے
چائے کی پتی سے کٹ سکتا ہے بندے کا جگر

جگر کا لفظ حوصلہ مندی کے معنی بھی دیتا ہے۔اب یہ صارفین کی حوصلہ مندی ہی تو ہے کہ وہ صحت کے خلاف اس یلغار کو بڑے اطمینان کے ساتھ برداشت کئے جا رہے ہیں۔ہمارے کان ایسے مجرم ہیں کہ اس فعل قبیح کی خبریں بھی سنتے رہتے ہیں اور پھر ان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ہمیں اس سے کیا غرض کہ گوالا دودھ میں پانی ڈالتے ہوئے اس میں کچھ مینڈکیاں بھی انڈیل دے۔

مانا کہ ہم ایک بڑی ضرورت مند قوم ہیں لیکن ہم نے بہت سی بے ضرورت چیزوں کو بھی اپنے لیے اشد ضروری قرار دے رکھا ہے۔کپڑوں پر وہاں بھی بٹن لگا لیتے ہیں جہاں بٹن کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔

ہمیں سب سے زیادہ صرف ایک چیز کی ضرورت ہے جسے علامہ اقبال احساس زیاں کہتے ہیں۔ایمان کا اونچا درجہ یہ ہے کہ برائی کو ہاتھ سے روک دیا جائے۔اس سے کم درجہ یہ ہے کہ زبان سے اس کی مذمت کی جائے اور سب سے کمزور ایمان یہ ہے کہ انسان کا ضمیر اسے برا محسوس کرے۔لیکن نہ جانے ہمیں کیا ہو گیا ہے کہ زمین بھی ہلنے لگے تو ہم نہیں ہلتے۔

◆◆◆

کچھ لطیفے شاعروں اور مشاعروں کے

شاعر خدا کی ایسی مخلوق ہے جس کے فکر و خیال کی رعنائیوں سے معاشرے میں بڑی رونق ہے۔اسی طرح مشاعرے کا ادارہ بھی اپنے اندر بڑی دلچسپی کا سامان رکھتا ہے۔ برصغیر کی اس روایت میں دم خم نہ ہوتا تو آج اسے عالمگیر حیثیت حاصل نہ ہوتی۔ اسی لیے تو اس وقت ہندوستان اور پاکستان کی سب سے بڑی برآمد شعرائے کرام ہیں۔ یہ لوگ بیرونی ممالک میں مشاعرے لوٹتے ہیں اور پھر اپنے وطن کو لوٹ آتے ہیں۔ بہرحال اس مخلوق اور اس ادارے سے متعلق بہت سے ایسے لطائف ہیں جن کی گرد آوری کی جائے تو بڑی مقدار میں بڑا دلچسپ مواد جمع ہو سکتا ہے۔اس مضمون میں اس سلسلے کی چند ایک جھلکیاں دکھائی جا رہی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

ایک شاعر فارسی کا شعر سنا رہا تھا۔کسی نے اس سے پوچھا کہ یہ شعر کس کا ہے۔اس نے بڑے دھڑلے سے جواب دیا کہ

''یہ شعر میرا ہے۔''

سوال کرنے والے نے بھی پورے اعتماد سے کہا کہ شعر آپ کا نہیں ہے۔

شاعر نے بڑے وثوق سے اپنے اصرار کو دہرایا۔''جناب عالی!یہ شعر میرا ہے۔''

حزب اختلاف نے شاعر کی اطلاع کے لیے عرض کیا۔''جناب عالی یہ شعر تو خواجہ حافظ شیرازی کا ہے اور آپ نے حافظ کا شعر چرا لیا ہے۔''

شاعر نے جواب دیا کہ ایسا نہیں ہے' حقیقت یہ ہے کہ حافظ نے میرا شعر چرا لیا ہے۔

معترض نے جواباً عرض کیا کہ آپ تو حافظ کے زمانے میں تھے ہی نہیں۔

شاعر نے زوردار لہجے میں ارشاد کیا کہ حضور' اسی لیے تو حافظ نے چرا لیا تھا۔آپ خود ہی سوچئے' میں اس وقت موجود ہوتا تو حافظ کو چرانے دیتا۔

مولانا عبدالرحمٰن جامی سے ایک شاعر نے کہا کہ میں جب حج پر گیا تو اپنا دیوان بھی ساتھ لے گیا۔طواف کعبہ کے دوران میں نے برکت حاصل کرنے کے لیے اپنے دیوان کو حجر اسود کے ساتھ خوب رگڑا ہے۔مولانا جامی نے جواب دیا کہ آپ اسے آب زمزم میں ڈبو لیتے تو اور بھی زیادہ برکت پیدا ہو جاتی۔

اسی طرح مولانا جامی سے ایک شاعر نے کہا کہ میں نے ایسا زوردار قصیدہ لکھا ہے جو اس تشہیر کا مستحق ہے کہ اسے جلی الفاظ میں لکھ کر فصیل شہر کے بڑے دروازے پر آویزاں کر دیا جائے۔

مولانا جامی نے فرمایا کہ کسی کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ عظیم تخلیق کس عظیم شاعر کی ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ قصیدے کے ساتھ آپ کو بھی دروازے پر لٹکا دیا جائے۔

پاکستان کے زندہ دل اور دم خیز شہر گجرات میں ایک عظیم الشان مشاعرہ ہو رہا تھا۔ شعراء کی تعداد اتنی تھی کہ مشاعرہ ختم ہونے کو نہیں آ رہا تھا۔ فجر کی اذان کا وقت بھی ہوا چاہتا تھا اور سامعین کی کثیر تعداد پنڈال سے رخصت ہو چکی تھی۔ جو باقی بچے تھے جمائیاں لے رہے تھے ان کی حالت یہ تھی کہ ادھر دو چار بیٹھے ہیں ادھر دو چار لیٹے ہیں۔

سامعین میں سے ایک منچلے اور دل جلے نوجوان نے بڑی بلند آواز میں یہ تبصرہ کیا اور وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ ''ایس سال ہدوانا تے شاعر ہویا ای بوہت اے جی'' یعنی اس سال شاعر اور تربوز پیدا ہی بہت ہوئے ہیں۔

ایک مشاعرے میں بڑے دلکش ترنم کے ساتھ بسمل صابری نے اپنی غزل کا یہ خوبصورت مطلع چھیڑا۔

وہ اشک بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

سامعین میں سے کسی کی آواز گونجی ''بی بی! یہ ڈوو والا شعر ولا کے پڑھیں۔'' یعنی یہ مینڈک والا شعر مکرر ارشاد ہو۔ اس دن کے بعد بسمل صابری فرمائش کے باوجود یہ غزل سنانے سے احتراز کرتی ہیں۔

ایک بزرگ شاعر ایک مشاعرے میں غزل سرا تھے۔ ان کی کلاسیکل انداز کی غزل بڑی ہٹ جا رہی تھی ناگاہ پرفارمنس کی شدت سے ان کی مصنوعی بتیسی ان کے منہ سے نکل کر اسٹیج پر گر گئی۔ یہ منظر خود بڑا قہقہہ آور تھا۔ اس صورت حال پر خود شاعر نے اپنے تبصرے سے وہ رنگ بھرا کہ ہال میں دیر تک تالیاں گونجتی رہیں۔ شاعر نے فرمایا۔

''حضور اب خالص زبان کا شعر ملاحظہ فرمایئے۔''

ایک مشاعرے میں ایک شاعر دھواں دھار طریقے سے اپنا کلام سنا رہے تھے۔ قافیہ اور ردیف کچھ یوں تھا۔۔۔۔۔۔ گلستان غزل' ارمغان غزل' اور کاروان غزل وغیرہ۔ اس سلسلے میں انہوں نے کوئی قافیہ چھوڑا نہیں تھا۔ کافی وقت گزر چکا تھا اور غزل ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔ اسٹیج پر جناب ضمیر جعفری بھی تشریف فرما تھے۔ انہوں نے سوچا کہ قافیوں کی یہ موسلا دھار بارش جاری رہی تو باقی

شاعری کی باری آنے سے رہی۔ آخرانہوں نے شاعر صاحب سے مخاطب ہوکر فرمایا کہ حضور پسماندگان غزل کا بھی کچھ خیال کیجئے۔ جعفری صاحب کا یہ بے ساختہ جملہ شاعر کی روانی کو بریک لگانے میں بڑا کارگر ثابت ہوا۔

لیجئے ایک آپ بیتی سنئے ۔۔۔۔۔۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد کے طلبہ نے ایک مشاعرے میں مجھے مہمان خصوصی کی حیثیت سے بلایا۔ جب میں پہنچا تو مائیک پر بڑے زور کا اعلان ہوا کہ سامعین پروفیسر صاحب پہنچ گئے ہیں اور اب مشاعرہ شروع ہونے والا ہے۔ میں ہال کے دروازے پر پہنچا تو مجھے ایک غیر معمولی طویل یعنی قد آدم ہار پہنایا گیا۔ ہار میرے ٹخنوں کو چھورہا تھا۔ جب میں نے نیچے نظر دوڑائی تو اس پر لکھا تھا۔ ''شادی مبارک ہو۔''

میں نے واپسی پر یہ واقعہ اپنی اہلیہ کو سنایا تو انہوں نے بے ساختہ کہا۔

''فیر تسی کلے ای آ گئے او۔'' (یعنی پھر آپ اکیلے ہی آ گئے ہیں)

امریکہ میں شکاگو ایئرپورٹ پر فلائیٹ کے انتظار میں جمیل الدین عالی' امجد اسلام امجد اور منیر نیازی خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے سکوت توڑنے کے لیے منیر نیازی سے کہا۔ ''منیر صاحب! انسانی جسم میں دو چیزیں ایسی ہیں جنہیں کاٹا جائے تو خون نہیں نکلتا۔''

منیر نے پوچھا ''کون سی؟''

میں نے کہا۔ ''بال اور ناخن''

منیر تھوڑی دیر سوچنے کے بعد یوں گویا ہوا۔

''انوراتوں ساڈے پنڈ دا نائی نہیں ویکھیا۔'' (یعنی تم نے ہمارے گاؤں کا نائی نہیں دیکھا)

عبیر ابوذری پنجابی کے بڑے کمال شاعر تھے۔ عوامی لہجے میں انہوں نے بڑی خوبصورت مزاحیہ شاعری کی ہے۔ ''پانی وچ مدھانی'' اور ''پاٹڑ کرارے'' ان کے مشہور شعری مجموعے ہیں۔ ماشاء اللہ طبیعت بھی بڑی باغ و بہار تھی۔ ایک روز ایک ڈاکٹر کے پاس گئے اور ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ میری دائیں ٹانگ میں شدید درد رہتا ہے' اس کا کچھ کیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ آپ کی عمر کتنی ہے۔ کہنے لگے۔ ''نوے سال'' ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔ ''اب آپ ہی بتائیں کہ ۹۰ سال کی ٹانگ میں درد نہ ہو تو اور کیا ہو؟'' عبیر صاحب نے فوراً اپنی بائیں ٹانگ ڈاکٹر صاحب کے آگے رکھ دی اور کہنے لگے۔ ''ڈاکٹر جی ۔۔۔۔۔۔ یہ ٹانگ بھی تو نوے (۹۰) سال کی ہے' اس میں درد کیوں نہیں ہے؟''

احمد فراز اور میں لاہور کے ریلوے اسٹیشن کے پاس سے گزر رہے تھے' وہاں پر ایک سستے سے ہوٹل کے باہر ایک شخص آواز لگا رہا تھا۔

''ایک روپیہ منجی بسترا بغیر جوؤں کے۔۔۔۔۔۔''

فراز نے اسے کہا کہ ''۱۲ آنے لگا لو (روپے میں ۱۶ آنے ہوتے تھے) جوئیں ہم اپنی لے آئیں گے۔''

کراچی کے ایک مشاعرے میں پیرزادہ قاسم اپنے خوبصورت ترنم کے ساتھ اپنی غزل سنا رہے تھے۔

خون سے جب جلا دیا تھا ایک دیا بجھا ہوا

پھر مجھے دے دیا گیا ایک دیا بجھا ہوا

احمد فراز پروین شاکر اور میں اکٹھے بیٹھے تھے۔ فراز نے پیرزادہ کی زمین میں مصرع اچھال دیا۔۔۔۔۔۔ ایک دیا لیا ہوا' ایک لیا دیا ہوا۔۔۔۔۔۔ عجیب قہقہہ بار منظر پیدا ہوا۔ پروین نے یہ مصرعہ اتنا انجوائے کیا کہ دیر تک اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکی۔

قصور شہر میں ایک شاعر خلیل آتش تھے۔ اپنے شہر میں وہ ملک الشعراء خیال کئے جاتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے قصور میں ایک بڑے پیمانے پر مشاعرہ کروایا اور مشاعرے کے مہمان خصوصی بھی وہی تھے۔ قصور کا جو شاعر بھی آتا تو وہ سب سے پہلے آتش صاحب کی توجہ حاصل کرتا۔ آتش صاحب ملاحظہ فرمایئے۔۔۔۔۔۔ آتش صاحب یہ شعر آپ کے نام ہے۔۔۔۔۔۔ آتش صاحب آپ کی خدمت میں مقطع عرض ہے۔۔۔۔۔۔ آتش صاحب ایک بالکل تازہ خیال ملاحظہ فرمایئے۔۔۔۔۔۔ پروفیسر گلزار وفا چوہدری بڑے زندہ دل انسان تھے اور برمحل جملہ کہنے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ جب ان کی باری آئی تو غزل شروع کرنے سے پیشتر گویا ہوئے کہ میں بھی اپنی غزل نذر آتش کرتا ہوں۔

گلزار وفا چوہدری اور امجد اسلام امجد کراچی سے ایک جہاز میں اکٹھے سوار ہوئے۔ جہاز جب لاہور کے قریب پہنچا تو ایسا غیر متوازن ہوا کہ سب لوگ سہم گئے۔ امجد نے اس خوف سے توجہ ہٹانے کے لیے گلزار سے پوچھا کہ جہاز کب تک لاہور ائیر پورٹ تک پہنچ جائے گا۔ گلزار وفا نے فوراً جواب دیا۔ ''امجد! اگر شاہدرے کا پھاٹک کھلا ہوا تو پانچ منٹ میں لینڈ کر جائے گا۔''

احمد فراز اور میں ملتان سے راولپنڈی آ رہے تھے۔ جہاز جب لینڈ کر گیا تو فراز نے مجھے کہا کہ اس مصرعے کے ساتھ مصرعہ لگاؤ۔

آخر کار آ گیا رن وے

مجھے فوری طور پر ایسا مصرعہ سوجھا جس کی فراز نے جی بھر کے داد دی۔

فلم اک یاد آئی ہے چن وے

ایک مرتبہ ہم ایک مشاعرے سے فارغ ہو کر واپسی کے لیے ایک بس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ بس میں شاعر بھی بہت تھے اور مکھیوں سے بھی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ کسی نے مصرع دیا کہ طبع آزمائی کیجیے۔

بس کے اندر مکھیاں اور بس کے باہر مکھیاں

میرے قریب اجمل نیازی بہت بڑی پگڑی باندھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے مصرعہ طرح پر جو مصرع لگایا' عرض کرتا ہوں۔

تاکہ مارے ان کو ضرب شملہ دستار سے
میں نے اجمل کی طرف بھیجی ہیں وافر مکھیاں

ایک مشاعرے میں ایک صاحب دستار شاعر اپنی غزل سنا رہے تھے۔ سناتے سناتے وہ ایک شعر بھول گئے۔ اس شعر کو یاد کرنے کی کوشش میں ان کا ہاتھ اپنی پگڑی کے شملے تک پہنچ گیا۔ سامعین میں سے ایک لڑکے کی آواز بلند ہوئی۔ شاعر صاحب اپنا انٹینا درست کر رہے ہیں۔

ایک مشاعرے میں شرکت کے لیے شعرا فیصل آباد جا رہے تھے۔ منیر نیازی فارغ البول ہونے کے لیے تھوڑے وقفوں کے بعد ویگن رکوا لیتے تھے۔ ایک مقام پر کسی نے پوچھا کہ فیصل آباد کا فاصلہ کتنا رہ گیا؟

شریف کنجاہی صاحب فوراً بول اٹھے۔ ''بس تین چار بولوں کی مار ہے۔''

ایک مرتبہ ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی ''واہ'' جا رہے تھے۔ دوران سفر میں دلچسپ گفتگو کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اچانک عطا نے امجد سے کہا۔ ''امجد تم آنے والے زمانے کے مشاہیر میں سے ہو۔'' امجد یہ جملہ سن کر ضرور خوش ہوا ہوگا لیکن خاموش رہا اور اس نے کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ عطا نے امجد کو خاموش پا کر اپنا جملہ ذرا بلند آواز میں دہرایا۔ ''امجد تم آنے والے زمانے س کے مشاہیر میں سے ہو۔''

امجد کسی تاثر کا اظہار کرنے ہی والا تھا کہ عطا نے مجھ سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''انور! دیکھو کتنا برا زمانہ آ رہا ہے کہ جس میں امجد جیسے مشاہیر بن جائیں گے۔'' عطاء الحق کالمی نے ان دو جملوں سے امجد کو اوج ثریا تک پہنچا کر تحت الثریٰ میں دے مارا۔ بے تکلفی میں اس نے بندے کی پروا نہیں کی لیکن جملہ ضائع نہیں جانے دیا۔

گجرات کے ایک مشاعرے میں ایک شاعر کی پنجابی غزل کا مطلع تھا۔

تیرے نین دو ٹھگ بنگال والے
ہولی چل اوئے حشر دی چال والے

گرمیوں کا موسم تھا۔ مشاعرے کی اگلی رات وہ غریب شاعر گلی میں اپنی چارپائی پر سو رہا تھا۔ کچھ لڑکوں کو (جو مشاعرہ سن چکے تھے) شرارت سوجھی' شاعر کو چارپائی سے زمین پر الٹ دیا اور اس کی چارپائی لے کر بھاگ نکلے۔ وہ اپنی چارپائی واپس لینے کے لیے ان کے پیچھے بھاگنے لگا۔ لڑکے چارپائی کھڑی کر کے اسی کا مصرعہ دہرا دیتے۔ ''ہولی چل اوئے حشر دی چال والے'' شاعر جب قریب آ جاتا تو لڑکے چارپائی اٹھا کر پھر بھاگ نکلتے۔ رات گئے تک یہ تماشا جاری رہا۔ شاعر اپنی چارپائی کے حصول کے لیے بھاگتا رہا اور اپنا مصرعہ سنتا رہا۔

ہولی چل اوئے حشر دی چال والے

حال ہی میں سرگودھا آرٹس کونسل نے قائداعظم کی یاد میں ایک آل پاکستان مشاعرے کا انعقاد کیا تھا۔ شعراء کی تعداد ستر سے بھی متجاوز تھی یعنی اسٹیج کی دو طرفہ سیڑھیوں کے آس پاس لگ بھگ ستر جوڑے جوتوں کے بکھرے پڑے تھے۔ وقفہ یہ وقفہ جب کوئی شاعر باہر کی فضا سے فیض یاب ہونے کے لیے اسٹیج سے اترتا تو جوتوں کے ڈھیر میں سے اپنے ناپ کا کوئی سا جوتا بھی استعمال کر لیتا تھا۔

یہ گھنا مشاعرہ رات کے آخری حصے میں اختتام کو پہنچا۔ شعرائے کرام اپنے اپنے جوتے پہن کر اپنی اپنی راہ لگے۔ آخر میں انتظامیہ کے کچھ لوگ اور امجد اسلام امجد ہال میں رہ گئے۔ امجد ننگے پاؤں جوتے کے ایک جوڑے کے پاس کھڑے دھڑا دھڑ قہقہے لگا رہا تھا۔ رفتہ رفتہ کئی لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے اور قہقہوں کا شور بڑھتا گیا۔ میں بھی اس ہجوم کی طرف لپکا۔ بھیڑ اتنی ہو گئی کہ گویا جوتا نیلام ہو رہا ہے۔ جوتے کے معائنے کے بعد میں بھی اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ جوتے کے دونوں پاؤں ایک ہی رنگ اور ایک ہی سائز کے تھے لیکن فرق یہ تھا کہ دایاں پاؤں کسی تسمے والے جوتے کا تھا اور بایاں پاؤں کسی مکیشن کا۔ حاضرین میں سے کسی اور کے پاؤں میں ایسا ہی کوئی اور جوڑا دریافت نہ ہو سکا۔ نہیں معلوم امجد نے کیا کیا ہو گا۔

اس واقعے کے چند روز بعد ٹیلی ویژن سٹیشن اسلام آباد کے ایک پروگرام کی ریکارڈنگ کے موقع پر جناب ضمیر جعفری صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے کہا کہ مشاعرے کے بعد آپ تو ہال سے تشریف لے گئے تھے لیکن امجد کے ساتھ عجیب واردات ہو گئی۔ میں نے سارا واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ ضمیر صاحب کو سنایا۔ ضمیر صاحب نے ایک ملال آلود اور افسوسناک قہقہہ لگا

کر کہا۔

''ہیں۔۔۔۔۔۔۔ایسا تو ایک انمل جوڑا میرے پاس بھی ہے۔ بایاں پاؤں تسمے والا اور دایاں پاؤں کسی مکیشن کا۔ مجھے تو کچھ پتہ نہیں چلا' جوتا مجھے پورا آ گیا تھا۔''

اس کے بعد ضمیر صاحب نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ایسے ہی اور بھی کئی جوڑے ان کے پاس بیکار اور محفوظ پڑے ہیں۔

◆◆◆

آوازِ دوست

دل بھی عجیب دقیانوسی چیز ہے جسے زمانے کے ساتھ چلنا آتا نہیں۔ یہ گھڑیال ایسا بدگمان ہے کہ ہمیں غافل سمجھتا ہے اور ہر گھڑی اپنی الٹی سیدھی منادی دیئے جاتا ہے۔ عجیب زاہد تنگ نظر ہے کہ ترقی کے سارے راستوں کا دشمن۔ اسے روکنے اور ٹوکنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہیں ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھایئے بیچ میں ضرور بول پڑتا ہے۔ زمانہ پاپ میوزک کا ہے اور یہ اپنا پکا راگ الاپتا چلا جا رہا ہے۔ کون ہے جو اس کے ہاتھوں تنگ نہیں تھا اور نہیں ہے۔

رندوں کو توبہ کی ایسی تلقین کرتا ہے کہ ان کے آگے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ اس نے ایک دفعہ بہت شور مچا کر کپل وستو کے شہزادے سے سدھارتھ کو تخت سے اٹھا کر بڑ کے درخت کے نیچے ایسا بٹھایا کہ پھر اٹھنے نہیں دیا۔ اسی کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی شاعر کو کہنا پڑا۔

ہے شور مرے چاروں طرف اور طرح کا
آتی ہے مرے دل سے صدا اور طرح کی

دل کے اندر سے جو صدائے ناصحانہ برآمد ہوتی رہتی ہے اسے ضمیر کی آواز بھی کہا جاتا ہے اور یہ ضمیر کبھی غائب نہیں ہوتی ہمیشہ حاضر رہتی ہے۔ لیکن اس کی کن مکن کے باعث گومگو کے عالم میں رہنا بھی زیادہ مناسب نہیں ہے۔ اب اتنی ڈھیر ساری آوازوں میں اس ایک آواز کی طرف کان دھریئے تو سارے کاروبار دھرے کے دھرے رہ جائیں' دنیا کی ساری گہما گہمی پر اوس پڑ جائے۔ ملاوٹ کا دھندا ہے تو وہ ختم ہو جائے۔ رشوت کا بازار گرم ہے تو وہ ٹھنڈا پڑ جائے۔ انتہا یہ ہے کہ یہ حضرت خوشامد جیسی بے ضرر چیز کے بھی خلاف ہیں حالانکہ ------- سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں۔

خوشامد اور سفارش آپس میں بہت قریبی رشتہ دار ہیں۔ سفارش کی اپنی ایک انفرادی اہمیت ہے۔ کسی دفتر میں چلے جائیں اس کے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔ چھوٹے افسر خود کہتے ہیں کہ کام کروانا ہے تو بڑے افسر کے لیے کوئی سفارش لے کر آیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ طب کی دنیا میں جوارش وہ کام نہیں کر سکتی جو معاملات کی دنیا میں سفارش کرتی ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ اگر آج کسی کام کے سلسلے میں میں کسی کی سفارش مانتا ہوں تو کل وہ میری کسی مشکل میں میری سفارش بھی ضرور مانے گا۔

اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے ------- یاں سودا دست بدستی ہے

دل اگر آڑے آتا ہے اور ان معقول باتوں سے روکتا ہے تو روکتا رہے لیکن رک جانا کہاں کی دانشمندی ہے۔ آخر عقل بھی تو کوئی چیز ہے۔ بھین سے بہت ہی بڑی ہے اس کی بھی تو ماننی چاہیے۔ ابھی کل ہی میرے ایک پروفیسر دوست مجھ سے کہہ رہے تھے۔ ''اب آپ ہی بتایئے' کیا یہ ہمارے نظام امتحانات کا خاصا نہیں ہے کہ بیشتر طلبہ کو تھرڈ ڈویژن ضرور دیتی ہے اور ایسے امیدواروں کا مستقبل سب کو معلوم ہے۔

داخلہ بند ہے کالج کی عمارت میں ترا
جا تجھے کشمکش علم سے آزاد کیا

اب کسی پر تحصیلات عالیہ کے دروازے بند کر دینا کہاں کا انصاف ہے۔ بھائی تھرڈ ڈویژن میں ہی سہی طالب علم پاس تو ہو گیا ہے اور اب اس نے عہد بھی کر لیا ہے کہ آئندہ تعلیمی میدان میں ریکارڈ توڑے گا۔ اس کے والدین بھی فی الحال اسے کسی ملازمت یا کاروبار کے جھنجھٹ میں نہیں ڈالنا چاہتے اور اسے مزید زیور تعلیم سے آراستہ کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔ اب ان عزائم کے ہوتے ہوئے طالب علم کو انجینئرنگ اور میڈیکل سائنس کے مطالعے سے محروم رکھا جائے؟''

پروفیسر صاحب فرمانے لگے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں پر داخلے کے سلسلے میں سفارش کی مخلصانہ کوششوں کی انتہائی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس بچے کے ابا' چاچا' تایا پھوپھا اور ماموں میرے جاننے والے نہ ہوں تو میرے جاننے والوں کے جاننے والے ضرور ہوتے ہیں۔ اور پھر اس ہمہ جہتی دباؤ کے تحت مجھے مجبور ہونا پڑتا ہے کہ سفارش اور سفارش کے عمل سے گزر کر اپنے پرنسپل سے بھرپور درخواست کروں کہ داخلہ ضرور دیا جائے ورنہ بچے کا سال ضائع ہو جائے گا۔ داخلے کے موسم میں امیدواروں کے سرپرست سر کھجاتے ہیں تو اس سے کئی قسم کے اندیشوں کی جوئیں جھڑنے لگتی ہیں اس موسم میں ہمارے بریف کیس میں سفارشی رقعوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا اور یہ رقعے نفس مضمون کے اعتبار سے (کام نہ ہونے کی صورت میں) قطع تعلق کی دھمکیاں لیے ہوئے ہوتے ہیں۔

اب آپ ہی بتایئے کہ میں اگر سفارش نہ مانوں اور یہ رقعے لیے لیے پرنسپل صاحب کے اردگرد نہ پھروں تو کتنے لوگوں کو ناراض کر بیٹھوں۔ آخر مجھے اس معاشرے میں رہنا بھی ہے۔ دوسروں کی ناراضی مول لے کر انسان آخر اطمینان کے سانس کیسے لے سکتا ہے اور شاعر نے یہ بھی تو کہا ہے۔

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

پروفیسر صاحب مزید گویا ہوئے کہ انٹرمیڈیٹ کے پریکٹیکل کا امتحان لینے کے لیے میرے کالج میں اگر کوئی ایسا ممتحن آ جائے جو اتفاق سے میرا جاننے والا ہو تو پھر احباب کا تانتا بندھ جاتا ہے۔ کئی ایک سفارشی رقعے ڈاکیے کے توسط سے ملنے لگتے ہیں۔ بھاگ کر گھر آؤں تو سفارشی ٹیلیفون کھڑکنے لگتے ہیں ------- کھنچے چمن سے تو مٹی مہک اٹھی گھر میں ------- ہر سفارش کے ہونٹوں پر یہی التجا ہوتی ہے کہ بچے کا آخری چانس ہے' اس کی ماں اس کے غم میں بیمار پڑی ہے۔ پریکٹیکل میں اچھے نمبر مل گئے تو اس کا کیریئر بن جائے گا۔ ساری عمر آپ کو دعائیں دیتا ہے رہے گا۔

بات بنتی ہے میری تیرا بگڑتا کیا ہے ------- اب التجاؤں کے اس سفارشی ریلے کے آگے ٹھہرنا کس کے بس کی بات ہے؟ بعض خواتین میری اہلیہ سے سفارش کرانے غریب خانے پر تشریف لے آتی ہیں۔ اہلیہ کی وساطت سے جو سفارش ہوتی ہے وہ انسان کو خاصا رقیق القلب بنا دیتی ہے آخر گھریلو زندگی کو غیر متوازن کرنے کا خطرہ کون مول لے سکتا ہے۔

بعض سفارشی ایسے ہوتے ہیں جو زندگی میں ہمارے بھی کسی کام آئے ہوتے ہیں اب ان کے سامنے کسی حیل و حجت کا اظہار تو احسان فراموشی کے زمرے میں آتا ہے۔ چلئے سفارش بری سہی لیکن احسان فراموشی تو بہت ہی بری چیز ہے۔ ایسے موقعوں پر چھوٹی برائی کو اختیار کرنے کا ایک اخلاقی اور منطقی جواز بھی ہوتا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ اندریں حالات انسان کو مجبور سفارش ہونا ہی پڑتا ہے لیکن ایک بات ضرور ہے کہ میں جب اپنی تنہائیوں کے حوالے ہوتا ہوں تو اس طرح کے سارے اخلاقی اور منطقی جواز مجھے ڈسنے لگتے ہیں اور علامہ اقبال کی بات درست لگتی ہے کہ عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے۔

دل دیوانہ سہی' دقیانوسی سہی' لیکن اس کے اندر سے اصحاب کہف کی آواز آتی ہے' اس کی اپنی ریت ہے اور پرانی ریت ہے کہ وہ مصلحتوں سے سمجھوتہ نہیں کرتا اور وقتی نفع اندوزیوں کے حق میں نہیں ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ شرف آدم پامال ہو جائے اسے انسان کے وسیع تر مفادات عزیز ہیں۔ محاسبے کے حساس لمحوں میں جب اردگرد کا شور تھم جاتا ہے تو پھر صرف ایک آواز سنائی دینے لگتی ہے۔ باہر کی آوازوں کے بھنور میں ڈوبنے سے بچانے والی آواز ------- یہ بجا کہ اپنے ہمدرد سے چڑ بھی جاتا ہے اس سے باغی بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنے آپ سے اتنا بھاگنا بھی نہیں چاہیے۔ انسان کو بڑے غور سے سننا چاہیے کہ

از کجا می آید ایں آواز دوست

◆◆◆

امورداخلہ

''ہیلو''

''السلام علیکم''

''وعلیکم السلام۔۔۔۔۔۔۔جی فرمایئے''

''انور مسعود صاحب سے بات کرا دیجئے۔''

''جی بول رہا ہوں۔''

''حضور! مزاج کیسے ہیں؟ میرا نام بختیار کھوکھر ہے۔آپ کو یاد ہو گا پچھلے برس ریل کار میں ملاقات ہوئی تھی آپ سے۔حضور اتنی مشکل سے تو چمن میں دیدہ ور بھی پیدا نہیں ہوتا جتنی مشکلوں سے آپ کا ٹیلیفون نمبر ملا ہے۔ڈائریکٹری میں غلط چھپا ہوا ہے۔''

''فرمایئے کیا حکم ہے؟''

''جناب میں تو یہی جانتا تھا کہ صرف آپ پروفیسر ہیں۔باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ بھی خواتین کالج میں پروفیسر ہیں۔''

''آپ کی اطلاع کی صداقت سے اختلاف ممکن نہیں ہے۔''

''تو پھر حضور گزارش یہ ہے کہ ہمارے ہمسائے کی بچی امتحانوں کے دوران کچھ بیمار رہی ہے اس لیے زیادہ نمبر حاصل نہیں کر سکی۔ ڈویژن وہی ہے جسے شائستہ زبان میں تین فرسٹ کلاسیں کہا جاتا ہے۔فرسٹ ائیر میں داخلہ مطلوب ہے۔والدین کی شدید خواہش ہے کہ بچی ڈاکٹر بن کر دکھی انسانیت کی خدمت کرے۔''

''بھائی یہ نمبر تو بہت ہی کم ہیں۔اس پوزیشن میں تو سادہ آرٹس میں بھی داخلے کی توقع بڑی مدھم ہے۔میرٹ بہت اونچا جا رہا ہے۔''

''حضور نمبر زیادہ ہوتے تو آپ کو سفارش کی زحمت ہی کیوں دیتے۔یہ سب کچھ آپ کے اختیار میں ہے۔''

''اچھا یہ بتایئے بچی کوئی امتیازی استعداد رکھتی ہے؟''

''جی کیا مطلب؟''

''یہی کہ کوئی خاص ٹیلنٹ حسن قرات' نعت خوانی' ترانہ سرائی اور تقریر وغیرہ۔۔۔۔۔۔سپورٹس میں اسے کوئی دلچسپی ہو' کوئی ہاکی' بیڈمنٹن' جوڈو کراٹے وغیرہ۔''

''جی۔۔۔۔۔۔میں یہ سب کچھ معلوم کرکے بتادوں گا۔آج آپ گھر پر ہوں گے نا؟ اچھا خدا حافظ''

ان دنوں ٹیلیفون پر بارہا مجھے بھی ایسی باتیں کہنی اور سننی پڑتی ہیں اور میری اہلیہ کو بھی۔لیکن داخلے کے لیے قواعد وضوابط اب ایسے کسے تنے ہیں کہ ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی۔جی چاہتا ہے کہ ان سے کہوں کہ اے کارپردازان شعبہ امتحانات وہ کلاس جواب ریل گاڑی سے بھی نکال دی گئی اسے تعلیمی اسناد سے کیوں خارج نہیں کیا جاتا۔تھرڈ کلاس کا لفظ معنی کے لحاظ سے سیکنڈ ہینڈ سے بھی گیا گزرا ہے اور اتنا مردود ہو چکا ہے کہ ناقص ترین چیزوں کی نشاندہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔کسی کو یہ کلاس عنایت کرنے کا مطلب یہی ہے کہ اسے ہر قابل ذکر ادارے سے دھتکار دیے جانے کا سرٹیفکیٹ دے دیا جائے۔

تیری دے کے ڈویژن زرہ لطف و کرم
ثانوی بورڈ نے پھر مجھ سے یہ ارشاد کیا
داخلہ بند ہے کالج کی عمارت میں ترا
جا تجھے کشمکش علم سے آزاد کیا

چلو یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ محکمہ تھرڈ کلاس ختم کر دیتا ہے تو پھر ایک اور مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔فیل ہونے والے بڑی بھاری اکثریت میں ہو جائیں گے اور پھر کیا معلوم کیا کر ڈالیں گے۔اس سیلاب بلا کو کون سنبھالے گا۔

نہیں ساحل تری قسمت میں اے موج
ابھر کر جس طرف چاہے نکل جا

میٹرک میں اچھے نمبر لینے والے داخلے کے امیدواروں کی پہلی ترجیح پری انجینئرنگ ہوتی ہے۔پھر پری میڈیکل اور آخر میں آرٹس اور آرٹس میں بھی شماریات' ریاضی اور اقتصادیات کی طلب ہے۔کسی سے کہو کہ میاں فارسی لے لے تو ایسا منہ بنائے گا جیسے اسے تیل کی دکان پر لا بٹھایا ہے۔کون سمجھائے کہ بھلے مانس سارا ایران فارسی بولتا ہے اور تیل بیچتا ہے۔تھوڑی سی پڑھ لو اردو ٹھیک ہو جائے گا۔گفتگو کا سلیقہ آجائے گا۔کچھ آداب سیکھ لو گے۔رومی اور اقبال کی محفل نصیب ہو جائے گی۔لیکن زمین جنبد نہ جنبد گل محمد

واقعہ یہ ہے کہ سائنس میں داخلہ لینا اس گلی میں داخل ہونے والی بات ہے کہ جس کی دوسری جانب کوئی رستہ نہیں۔آرٹس پڑھنے

والاتو چوراہے میں کھڑا رہتا ہے' جس طرف کو چاہے نکل جائے۔وکیل بنے' پروفیسر بنے' سول افسر بنے' ٹی وی یا ریڈیو کا پروڈیوسر بن جائے' کوئی کام کر لے وغیرہ وغیرہ۔

سائنس والوں کے لیے انٹر کے بعد وہی مسئلہ اور پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ۔میڈیکل کالج اور انجینئرنگ کالج میں داخلے کا ہولناک مسئلہ۔۔۔۔۔۔پرچوں کا تعاقب کرنے والے اور ہزاروں روپوں کی ٹیوشن دے سکنے والے بسا اوقات اتنے ڈھیر سارے نمبر چھین کر لے جاتے ہیں کہ بیشتر Geniune امیدواروں کی داخلے کی درخواستیں داخل دفتر ہو جاتی ہیں۔ بھاری جیب اور لمبے بازوؤں کا جادو ہر دور میں چلتا رہا ہے۔

کتنی جوانیاں ڈویژن Improve کرنے کی مشقت میں تلف ہو جاتی ہیں۔کوئی یہ ہفت خوان طے کر لے تو ملازم کی حیثیت سے کسی سرکاری دفتر میں داخلہ نہیں ملتا۔ کتنے ڈاکٹر اور کتنے انجینئر کتنے سالوں سے بے روزگار ہیں۔۔۔۔۔۔پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔۔۔۔۔۔اونچے معیار کے حصول نے بھی تو ایک اودھم مچا رکھا ہے۔ایک فارسی شاعر نے کتنی عمدہ بات کی ہے کہ لالچی آنکھ کو قناعت پر کر سکتی ہے یا قبر کی مٹی۔ہمارے ہاں تو اونچی ملازمت کی خواہش کے ساتھ مرضی کا مقام ملازمت لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔

اب	تو	اس	کو	ماسوا	لاہور	کے

اب تو اس کو ماسوا لاہور کے
شہر بھی کوئی پسند آتا نہیں
ڈاکٹر بننے کو آیا گاؤں سے
ڈاکٹر بن کر وہاں جاتا نہیں

نہیں معلوم کس حکیم نے یہ بتلا رکھا ہے کہ ضرور ڈاکٹر بنو' ضرور انجینئر بنو' کوئی یہ نہیں بتاتا کہ بھائی میٹرک کے بعد کوئی اچھا سا دھندا' کوئی دستکاری' کوئی چھوٹا موٹا ہنر سیکھ لو' کسی ٹیکنیکل ادارے کا رخ کر لو۔لیکن وہاں بھی تو داخلے کا مسئلہ ہے۔ساری پلاننگ کی گڑبڑ ہے اور یہ گڑبڑ کہاں نہیں ہے۔

◆◆◆

کار

"کار" کا مطلب کام بھی ہوتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ اس دور میں یہ لفظ ان معنوں میں ترک ہو کر بے کار سا ہو کر رہ گیا ہے۔

اب تو ساری تنظیمیں کام نہ کرنے سے وابستہ ہو گئی ہیں۔

"جو لوگ کچھ نہیں کرتے کمال کرتے ہیں"

اب تو کار کا بس ایک ہی مفہوم ہے اور وہ ہے موٹر کار۔ دسویں جماعت کے پرچے میں کچھ الفاظ جملوں میں استعمال کرنے کے لیے دیئے گئے ان میں کارگزاری کا لفظ بھی تھا۔ ایک امیدوار نے اس لفظ کو جملے میں یوں استعمال کیا۔ "ہم نے پل پر سے کار گزاری" ایک شاعر نے کارساز کے لفظ کو بھی اس تلازمے سے اجاگر کیا ہے۔

تیل کا مشکل نہیں ہے مسئلہ
وہ ہمیں ایران سے مل جائے گا
کار بھی جاپان سے آ جائے گی
"کار ساز ما بہ فکر کار ما"

یعنی جاپان ہمارا کارساز ہے کہ ہمارے لیے کاریں بناتا ہے اور اب تو ماشاء اللہ ملک خود کارسازی کے مرتبے پر فائز ہو گیا ہے اور اب تو ہر شخص اپنے اسٹیٹس کو ایسا بنانا چاہتا ہے جس سے معلوم ہو سکے کہ وہ ایک مملکت کارساز کا باشندہ ہے۔

کاروبار زندگی اتنا تیز رفتار ہو گیا ہے کہ جن چیزوں کو تعیشات کہا جاتا تھا کہ آج وہ ضروریات کے زمرے میں شامل ہو گئی ہیں اور آنے والے کل کو یہی ضروریات بنیادی ضروریات بن جائیں گی۔

ان دنوں جن گھروں میں بجلی کی استری، واشنگ مشین، گرائنڈر، جوسر، ٹیلیفون، ٹیلیویژن، مائیکرو ویو اوون اور ڈیپ فریزر میں سے کوئی چیز بھی کم ہو تو وہ بڑا دقیانوسی گھر خیال کیا جاتا ہے۔

کسی زمانے میں آسودہ حالی کی علامت باہر کھونٹے پر بندھی ہوئی بھینس ہوتی تھی اور وہ گھرانا تو انتہائی خوشحال گھرانہ ہوتا جس کے پاس اپنا اصطبل ہوتا تھا اور اصطبل میں گھوڑے اور گھوڑیاں ہوتی تھیں۔ زمانہ کتنا بدل گیا ہے کہ خوشحال گھرانہ اسے سمجھا جاتا ہے

کہ جس میں

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیمار دار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

اب کھونٹے سے بھینس باندھنے کا زمانہ گیا اب تو گھر کے بیرونی حصے میں گیراج اور اس میں نئی نویلی کار ہونی چاہیے۔

علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے بڑی دلسوزی سے کہا ہے کہ مجھے اس زمانے سے ڈر لگتا ہے جس میں تو پیدا ہوا ہے کہ یہ زمانہ بدن میں ڈوب گیا ہے یعنی تن آسانیوں کے سامان پیدا کر رہا ہے اور مادی آسائشوں کا حصول ہی واحد مقصد حیات رہ گیا ہے۔ انسان باہر سے اپنے آپ کو سجائے چلا جا رہا ہے اور اندر سے اتنا ہی ویران ہوتا جا رہا ہے۔ شکیب جلالی نے کیا خوب کہا ہے۔

ملبوس خوشنما ہیں مگر جسم کھوکھلے
چھلکے سجے ہوں جیسے پھلوں کی دکان پر

اور اب تو وقت کی پکار بھی یہی ہے۔ ماحول کا تقاضا بھی یہی ہے۔ بیوی بچوں کا مطالبہ بھی یہی ہے کہ ''بے کار معاش'' یعنی تمہارے پاس کار ہونی چاہیے۔ اور اب تو یہ معمول ہو گیا ہے کہ ناشتے کے وقت دوپہر کے کھانے پر رات کے کھانے پر ہر فرد خانہ کی گفتگو اس محور کے گرد گھومتی ہے کہ ابو اب تو کار لے ہی لیجئے حالانکہ یہ اوقات ایسے ہیں کہ طبی نقطہ نظر سے ایسی کوئی بات نہیں کہنی چاہیے۔ جو سوء ہضم کا باعث بن سکتی ہو۔

میں لاکھ سمجھاتا ہوں کہ دنیاداری کے معاملات میں ان کی طرف دیکھنا چاہیے جن کو بنیادی ضروریات بھی میسر نہیں اور جہاں تک دین کا تعلق ہے ان لوگوں کی مثال پیش نظر رہنی چاہیے جو زیادہ متقی اور پرہیز گار ہیں۔ جواب یہ ملتا ہے کہ ٹھیک ہے آدمی کو پرہیز گار ہونا چاہیے لیکن پرہیز کار بالکل نہیں ہونا چاہیے۔

میں پھر سمجھانے لگتا ہوں کہ دیکھئے' فرج' فریزر' ٹیلیفون اور ٹیلی ویژن کے مرحلے طے ہو گئے ہیں اور نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بچوں پر خاص طور پر ٹیلیویژن کے اثرات اچھے نہیں پڑتے اس لیے کہ ٹی وی میں اچھے پروگراموں کے لیے ایسے اوقات مقرر ہیں جو پڑھائی کے اوقات ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں کہ تمہاری درسی کارکردگی کے حق میں یہ سوغات کتنی مفید ثابت ہوئی ہے؟ کیا کیا جائے کہ ان ذرائع ابلاغ نے جدید نسل کے ذہن ایسے تیز کر دیئے ہیں کہ وہ بڑی سے بڑی دلیل کو کاٹ کے رکھ دیتے ہیں کہ آدمی کو اپنے

موقف پر ٹھہرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ بچے کہتے ہیں کہ ٹی وی کے تذکرے سے بات کو کھٹلے میں نہ ڈالیں۔ ہم تو کار کی بات کر رہے ہیں۔ اب آپ ہی بتائیں' ہمارے آگے پیچھے' دائیں بائیں کوئی ایسا گھر ہے جن کے پاس کار نہ ہو۔ ایک ہم ہیں کہ ہمارے نصیب میں بسوں اور سوزوکیوں کے دھکے لکھے ہوئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ پٹرول مہنگا ہوگیا ہے جواب ملتا ہے کہ مہنگائی کی نسبت سے تنخواہوں میں اضافے کا فارمولا زیر غور ہے لہٰذا اس سلسلے میں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ بیک وقت اتنی رقم کہاں سے آئے لیکن بچوں کو معلوم ہے کہ جی پی فنڈ سے قرض بھی لیا جاسکتا ہے اور محکمے کو فوری ضرورت کی یقین دہانی کرادی جائے تو یہ قرض Out of the Way بھی دستیاب ہوسکتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ پونجی کسی زیادہ اہم ضرورت کے لیے جمع رہنی چاہیے۔ جواب ملتا ہے کہ کار سے زیادہ اہم ضرورت کی کوئی اور چیز بھی ہوسکتی ہے۔ بچوں کے دلائل کے سامنے میری ساری دور اندیشیاں' کوتاہ اندیشیاں ثابت ہوتی چلی جاتی ہیں۔ میں نے یہ دلیل پیش کی کہ ایسے قرضوں پر بہت زیادہ سود دینا پڑتا ہے اور آپ جانتے ہیں کہ سود لینا اور دینا جائز نہیں۔ لیکن میری یہ دلیل بھی بے کار اور بے سود خیال کی جاتی ہے۔ جواب ملتا ہے کہ حکومت نے جدید بینکاری کے نظام کو سود سے پاک کر دیا ہے تو قرض کا نظام بھی خود بخود سود سے پاک ہوجائے گا' لہٰذا بسم اللہ کیجئے۔ کار ایڈوانس کے لیے Apply کر دیجئے اور فی الحال سوزوکی کار کے لیے کچھ ایڈوانس رقم جمع کرا دیجئے۔ اپنے قرضے کے کیس کو سفارشی سطح پر Pursue کیجئے' ان شاء اللہ چند دنوں تک موٹر کار کی خریداری کا مسئلہ بڑی آسانی سے طے ہوجائے گا۔

جن دنوں ٹی وی اور ٹیلیفون لگوانے کے مطالبے نے زور پکڑا تھا تب بھی میں نے کتنی ہی دفعہ دلیلوں اور اپیلوں کا سہارا لیا تھا لیکن موجودہ دور میں اپنے ہی بچوں کے سامنے

کتنی ہلکی ہیں دلیلیں میری
کون سنتا ہے اپیلیں میری

میں تمدن کی اس جدید دوڑ میں شامل ہونے والے ہر مطالبے کو ابتدا میں ٹالتا چلا گیا اور آخر میں مانتا چلا گیا اور یہ میرا حال ہی نہیں ٹی وی ان کے گھر میں بھی گھس گیا ہے جو اسے شیطان کہا کرتے تھے۔ کار ان کے پاس بھی ہے جو تانگے کو شاہی سواری کہا کرتے تھے اور پیدل چلنے کے فوائد پر پہروں لیکچر دیا کرتے تھے۔ اب تقریباً ایک سال ہوگیا کہ میں بیوی بچوں کے کار خریدنے کے مطالبے کو ٹالے چلا جا رہا ہوں لیکن اب ہمت جواب دے گئی ہے۔ بچوں کے الفاظ ذہن میں گونجتے رہتے ہیں کہ آپ اس عمر میں بسوں اور سوزوکیوں میں سفر کرتے ہوئے اچھے نہیں لگتے اور ٹیکسیوں کے اخراجات بھی کیسے برداشت کئے جا سکتے ہیں جن کے میٹر ان کے

پہیوں سے زیادہ تیز چلتے ہیں اور ضرورت کے وقت نہ بس ملتی ہے اور نہ ٹیکسی ہاتھ آتی ہے اور بس سٹاپوں کی بے رحم دھوپ اور بھیڑ کب تک برداشت کی جاسکتی ہے؟

یوں نہ بھی ہو تو کیا ہے

ہمارے یہاں ریس کرنے کی ریس لگی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ پڑوسن کا منہ سرخ ہو تو اپنا منہ تھپڑ مار کر سرخ کر لینے کا رواج پیدا ہو گیا ہے۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا چلا جا رہا ہے۔ ہر کوئی اپنے آپ کو دوسروں سے بڑھ چڑھ کر صاحب حیثیت اور صاحب ثروت ثابت کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔۔۔۔۔۔۔ ہر بندہ ہے محو خودنمائی۔۔۔۔۔۔۔ اور یہ مریضانہ خودنمائی وبائی ہو گئی ہے۔ اس خودنمائی کو بے انتہا پریشانیاں بھی لاحق ہیں لیکن ہمیں کچھ پرواہ نہیں۔ ہم یہی سمجھے بیٹھے ہیں کہ آسانیوں سے زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔ شاعر نے تو بہت سمجھایا تھا۔

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
اچھے ہیں وہی جو کہ تکلف نہیں کرتے

تکلف کے بغیر بھی اچھا خاصا گزارہ ہو سکتا ہے لیکن ہم رسم و رواج کے بھنور سے باہر نہیں نکل پاتے اور چکر لگاتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے معاشرتی رویوں میں سب سے زیادہ نمایاں اسراف کا رویہ ہے۔ ''چادر کا رقبہ دیکھنے کی ہمیں عادت ہی نہیں ہے۔ بس پاؤں پھیلانے کا چسکا ہے۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ہمیں منافقت کا روگ بھی لگا ہوا ہے۔ ہم اسراف کرتے جائیں گے اور اسراف کو برا بھی کہتے جائیں گے۔ بیٹی کو جہاز بھر کر جہیز دینے والا بھی یہی کہتا ہے کہ سادگی بہت اچھی چیز ہے۔ ہماری مثال بالکل اس شخص کی سی ہے جس نے کسی بچے سے پوچھا۔ ''تم انگریزی بولتے ہو؟''

بچے نے جواب دیا۔ ''جی ہاں''

اس شخص نے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ

''مائی سن! انگریزی مت بولو It is bad habit''

ہمارے یہاں زندگی کے ہر میدان میں اسراف ہی اسراف دکھائی دیتا ہے۔ ہمارے مقررین کا الفاظ کے ساتھ وہی رویہ ہے جو بگڑے ہوئے جاگیردار کا روپے پیسے کے ساتھ ہوتا ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر مقررین بولنے پر آتے ہیں تو ڈکشنریاں بولتے چلے جاتے ہیں۔ وقت کو ہم اس طرح خرچ کرتے ہیں جیسے دنیا میں سب سے زیادہ ہمیں کو الاٹ کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں کسی تقریب کا دو چار گھنٹے لیٹ ہو جانا اور پھر دو چار گھنٹے طویل ہو جانا معمول کی بات ہے۔

شادی بیاہ کی تقریبات کو ہم نے خوراک کھانے کے مقابلوں کی تقریبات بنا رکھا ہے۔ ادھر کھانا لگتا ہے ادھر مہمان پل پڑتے ہیں' جو خود بڑھ کر اٹھا لے ہاتھ میں مرغا اسی کا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی غیر ملکی ہمارے اسلوب خورد و نوش کا نظارہ کرے۔

پہلے شادی بیاہ کی تقریبات میں زیادہ سے زیادہ دو تین ڈشیں ہوا کرتی تھیں' اب تو ماشاء اللہ روسٹ مرغ' بالٹی گوشت' کلیجی پالک' انڈے کوفتے' قیمہ مٹر' باداموں سے اٹا ہوا قورمہ' مرغ پلاؤ' آلو بخارے کی چٹنی' بادام' پستے' کروندے اور رس گلوں کی دبیز تہوں میں دبا ہوا متنجن اور پھر موسم کے سارے پھل' اس کے علاوہ قلفی' فالودہ اور پھر پانی کے بجائے سیون اپ اور کوکا کولا۔

پہلے کھانے والے بھی راحت میں رہتے تھے اور کھلانے والے بھی۔ ان تقریبات میں آلو گوشت پکانے کا رواج بھی ہوتا تھا۔ شوربا بھی کوئی قابل اعتراض چیز نہیں تھا جو اب مائع ممنوع ہو کر رہ گیا ہے۔ اور آلو سستا ہونے کے باعث اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اسے گوشت کے ساتھ میل ملاپ کی اجازت دی جائے۔ ''نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نئیں پایا''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کھانے اتنے مرغانہ اور مرغن نہ ہوں تو کیا نکاح میں کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے۔ اگر سادگی سے کیا جائے تو کیا ولیمہ ادھورا رہ جاتا ہے؟ کیا یہ فرض ہے کہ قرض لے کر بہت ساری دیگیں پکائی جائیں۔ کھانے والوں کی جان بن جائے اور کھلانے والوں کی جان پر بن جائے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ کثرت سے کھانا پکایا جائے تو کثرت سے ضائع بھی ہوتا ہے۔ یہ زیان بے جا ناگزیر تو نہیں۔

مجھے گوجرانوالہ میں ایک افطار پارٹی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ فرشی انتظام تھا۔ ایک بہت بڑے کمرے کے وسیع و عریض فرش پر اتنی ڈھیر ساری ڈشیں سجی تھیں کہ روزہ داروں کو بیٹھنے کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ وہاں پر بیٹھے ہوئے میں یہی سوچتا رہا' کیا روزے کا مقصد یہی ہے کہ اتنا کھایا جائے کہ پیٹ قمیض کے سائز کو چھوٹا کر دے۔ کیا یہ اسراف روزے کی مقصدیت کے حصول میں حائل نہیں؟ کیا کھجور اور ٹھنڈا پانی اور سادہ معقول کھانا افطاری کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

یہ بجا ہے کہ بخل اور ضرورت سے زیادہ صرفہ جوئی کوئی اچھی بات نہیں ہے لیکن اسراف بھی تو قابل مذمت ہے۔ قرآن کا یہ ارشاد میانہ روی کا بہترین درس ہے۔ ''کلوا و اشربو ولاتسرفو'' (کھاؤ پیو لیکن اسراف نہ کرو) قرآن سے الہام پذیر ہو کر سعدی نے کتنی عمدہ بات کہی تھی کہ کھانا جینے کے لیے ہے جینا کھانے کے لیے نہیں ہے۔

ہے سوچنے کی بات اسے بار بار سوچ

◆◆◆

کبیرا...... اسلام آباد میں

فیض آباد کے قریب میں نے ایک شخص کو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ بہت سادہ سا آدمی تھا۔ لیکن اس کے چہرے پر سوچوں کے انبار لگے تھے اور شدت کا گریہ طاری تھا۔ میں نے پوچھا تمہارا کیا نام ہے؟ کہنے لگا مجھے بھگت کبیر کہتے ہیں۔ اسلام آباد کی سیر کو آیا تھا اور اب واپس جا رہا ہوں۔ میں نے پوچھا' کیوں؟ کہنے لگا' جتنے مقامات آہ و فغاں میں نے اسلام آباد میں دیکھے ہیں اور کسی شہر میں نہیں دیکھے۔

میں نے پوچھا۔ ''رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا؟''

کہنے لگا۔ ''میں نے یہاں پر بڑی بڑی کوٹھیاں دیکھیں۔ ایسی عالیشان کوٹھیاں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ ان خوبصورت کوٹھیوں میں دس دس' پندرہ پندرہ بیڈ روم دیکھے۔''

میں نے کہا کہ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے' اس سے اس شہر کی خوشحالی کا پتہ چلتا ہے' اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟ کہنے لگا کہ جس بات پر میں رویا ہوں وہ یہ ہے کہ ان کوٹھیوں میں سونے کے کمرے تو بہت ہیں لیکن لوگوں کی آنکھوں میں نیند نہیں ہے۔ بیچارے سلیپنگ پلز کھاتے ہیں پھر بھی سونے کو ترستے ہیں۔ میں سوچتا رہا کہ اتنے آرام دہ کمروں میں بھی ان کو نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔ یہ کہہ کر وہ آہیں بھرنے لگا اور اس کی آواز پھر ہچکیوں میں دب گئی۔ میں نے ایک اور سوال کی گیند اس کی طرف پھینک دی۔ میں نے پوچھا' تم نے ہمارا سیکرٹریٹ دیکھا ہے؟ حکومت کے سارے محکمے اسی ایک عمارت میں موجود ہیں اور بڑے بڑے افسران محکموں کو چلا رہے ہیں۔ کبیرا کہنے لگا کہ میں نے یہ سیکرٹریٹ دیکھا ہے اور وہاں کئی بے محکمہ افسر بھی دیکھے ہیں۔ افسر بھی اور بے محکمہ بھی یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی اور جب میں نے یہ سنا کہ کئی وزیر بھی ایسے ہوتے ہیں جن کا کوئی محکمہ نہیں ہوتا تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

میں نے کبیرے سے پوچھا۔ ''تمہارا شعر و شاعری سے بھی گہرا تعلق ہے' تم نے اسلام آباد میں کسی ادبی حلقے میں شرکت کی ہے؟''

کہنے لگا۔ ''میں ایک حلقے میں گیا تھا' وہاں پر نثری نظم کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میرے لیے یہ ترکیب ایک ایسا ادبی صدمہ

تھا کہ مجھے نارنگی ہی سوجھی نہ گاڑی۔ میں اس قدر رویا کہ روتے روتے میری آواز بیٹھ گئی۔"

کبیرا کہنے لگا۔"میں نیشنل سنٹر بھی گیا۔ وہاں پر ایک بڑے علمی مسئلے پر گفتگو ہو رہی تھی۔ کوئی صاحب انگریزی میں بڑی زبردست تقریر کر رہے تھے۔ میں انگریزی نہیں جانتا۔ اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے میں نے پوچھا کہ یہ صاحب انگریزی میں کیا کہہ رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ اردو زبان کی اہمیت پر اظہار خیال فرما رہے ہیں۔ یہ سن کر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا کہ باہر جا کر جی بھر کے روؤں۔ کبیرا اپنی بپتا بیان کرتے ہوئے کہنے لگا۔"میں ایک عالیشان بلڈنگ کے پاس سے گزرا۔ وہاں سے اگربتیوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ معلوم ہوا کہ ایک کمرے میں قرآن خوانی ہو رہی ہے۔ وہاں کسی مسجد کے طالب علم بلائے گئے تھے۔ ایک میز پر قرآن کے سیپارے رکھے ہوئے تھے۔ لڑکے اور ان کے استاد بڑے خشوع وخضوع سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہے تھے۔ میں نے ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہاں پر صاحب خانہ اور ان کے کئی احباب بیٹھے ہیں، سگریٹ چائے اور خوش گپیوں کا دور چل رہا ہے۔ میں ایک ہی گھر میں یہ متضاد منظر نہ دیکھ سکا اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔

پھر میں جہاں پہنچا وہاں پر بڑی رونق تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ سپر مارکیٹ ہے۔ یہاں کی ہر چیز بڑی اعلیٰ اور نادر ہوتی ہے۔ اچانک میں نے ایک خاتون کو دیکھا جو بے پردگی اور پردہ داری کا عجیب سا نمونہ پیش کر رہی تھی۔ اس کا سر، اس کے شانے اور بازو بے لباس تھے لیکن ہاتھوں میں دستانے پہن رکھے تھے۔ یہ کہہ کر کبیرا پھر ہچکیاں بھرنے لگا۔

میں نے پوچھا تو نے ہمارے ٹی وی کا کوئی ڈرامہ دیکھا ہے۔ کہنے لگا' میں نے کئی ڈرامے دیکھے ہیں مگر میری سمجھ میں ایک بات بالکل نہیں آتی کہ وزیراعظم صاحب سر ڈھانپنے کا جتنا خیال کرتی ہیں ٹی وی کی خواتین آرٹسٹ دوپٹے کو سر سے دور رکھنے کا اسی قدر اہتمام فرماتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ مجھے اس بات کا قلق ہوا کہ گانا اب سننے کی نہیں دیکھنے کی چیز رہ گیا ہے۔

کبیرے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

میں سپر مارکیٹ سے آبپارے آیا تو دیکھا کہ ایک ویگن والے نے ایک ٹریفک انسپکٹر کے ہاتھ میں کوئی سرخ سا کاغذ تھما دیا۔ میں نے قریب جا کر دیکھا کہ وہ سو روپے کا نوٹ تھا جس پر یہ جملہ لکھا ہوا تھا۔"رزق حلال عبادت ہے"

یہ کہہ کر کبیرے نے مجھ سے جلدی جلدی اجازت چاہی اس لیے کہ وہ اپنے آنسو چھپانا چاہتا تھا۔

◆◆◆

چوریاں

بعض چوریاں بڑی خوبصورت ہوتی ہیں۔ مثلاً آنکھیں چرانا' غالب نے چوری کی اس واردات کے ایک لمحے کو کیسی خوبصورتی سے شکار کیا ہے۔

کل تم جو بزم ناز میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

بس اس میں تھوڑا سا یہی احتمال ہے کہ غیروں کی موجودگی میں یہ واردات کی جائے تو چھپا ہوا بھید کھل جاتا ہے ویسے اور کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ آنکھ ماشاء اللہ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہے اور دل کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ چوری ہو جانے کے باوجود بھی دل سینے میں موجود اور محفوظ رہتا ہے اور ای سی جی میں بھی کسی نمایاں خلل کی نشاندہی نہیں ہوتی البتہ دل کی دھڑکن میں کچھ سرور انگیز اضافہ ضرور ہو جاتا ہے جو اختلاج کی صورت اختیار نہیں کرتا۔

دل کے چور کو چور کہنے سے بھی عموماً گریز کیا جاتا ہے اور دلستان اور دلبر کے الفاظ پر ہی گزارا کر لیا جاتا ہے۔

دزدیدہ مرغ اور مرغیاں بھی بڑے قرینے سے حلال کر لی جاتی ہیں۔

مرغ چوری کا بوقت ذبح زیر پائے ہے
اس پہ پھر اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

شعروں کی چوری بھی بلاشبہ سرقے کے ذیل میں آتی ہے لیکن اس الزام سے بچنے کی بھی کئی صورتیں تلاش کر لی جاتی ہیں اگر بزرگوں کے شعر چرا لیے جائیں تو استفادہ کہہ کر اس حرکت کا جواز پیدا کر لیا جاتا ہے۔ ہم عصر شعراء کے شعروں پر ہاتھ صاف کر لیا جاتا ہے تو اسے توارد کہہ کر اپنی جان چھڑا لی جاتی ہے الغرض خوئے بد کے پاس اتنے ڈھیر سارے بہانے ہوتے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا۔

ہم نے اپنی بات آنکھوں سے شروع کی تھی اس لیے کہ چوری کی کوئی بھی Defination کی جائے آنکھ کا ذکر نا گزیر ہے۔

چوری ایک ایسی واردات ہے جس کا ارتکاب کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ اس کے فعل کو صرف اس کی آنکھ دیکھے اور دوسری کوئی آنکھ اس

میں ملوث نہ ہو اس لیے کہ اگر کئی ایک آنکھیں ایک ہی مقام پر مرکوز ہو جائیں تو لڑائی کا امکان ہے اور آنکھوں کی لڑائی اچھی نہیں ہوتی۔

البتہ چوری کی سب سے قبیح صورت یہ ہے کہ کسی کی آنکھ مصلے پر لگی ہوں اور وہ اپنے خالق حقیقی کے حضور میں محو نیاز ہو تو کوئی چپکے سے اس کا جوتا اڑا لے جائے اور ایسا ہوتا رہتا ہے۔ پچھلے دنوں مجھے اپنے ایک عزیز کو ملنے کے لیے اسلام آباد جانے کا اتفاق ہوا جب ان کے گھر کے قریب پہنچا تو قریب مسجد میں نماز مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ جماعت کھڑی ہوئی تو جوتا اتار کر میں نے مسجد کے اندر ایک محفوظ جگہ پر رکھ دیا اور پھر جماعت میں شامل ہو گیا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس مقام پر پہنچا جسے بہت محفوظ جان کر وہاں اپنا جوتا رکھا ہوا تھا تو جوتا وہاں موجود نہ تھا۔ محلے کے کئی نمازی بڑی خجالت کے عالم میں میرے ساتھ جوتا تلاش کر رہے تھے۔ یہ بالکل نئی کوہائی چپل تھی جو میں نے چند روز پہلے خریدی تھی۔ یا تو چپل کسی کو بہت زیادہ پسند آ گئی تھی یا کوئی مجھ سے زیادہ ضرورت مند تھا۔ بہر حال ایک صاحب نے اپنی ہوائی چپل مجھے پہنا دی اور پھر چپل واپس لینے کے لیے خود برہنہ پاؤں میرے ساتھ میرے عزیز کے گھر پہنچے۔ میرے عزیز نے ہم دونوں کو اپنے دروازے پر اس عالم میں دیکھا تو ان کے چہرے کی بشاشت بھی ندامت میں بدل گئی۔

یہ مسئلہ کوئی آج پیدا نہیں ہوا البتہ اس کا حل آج تک دریافت نہیں ہو سکا۔ مولانا حالی کا مزاج چونکہ اصلاحی تھا اس لیے غزل کہتے ہوئے بسا اوقات ان کے ہاں ایک اخلاقی آہنگ ابھرتا ہے۔ انہوں نے بھی اپنے دور میں نمازیوں کو غزل کے پیرائے میں ناگہانی طور پر پیش آنے والی اس صورت حال سے خبردار کیا تھا۔

اپنے جوتوں سے رہیں سارے نمازی ہشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت

مولانا حالی کے قیمتی مشورے پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسجد میں داخل ہو کر فرش مسجد پر جس طرح بھی نگاہ ڈالیے جوتے ہی جوتے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر صف میں سجدہ گاہ کے بالکل سامنے کالے کالے سرخ سرخ اور سفید سفید جوتے قطار اندر قطار نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض زیادہ محتاط نمازی منبر کے مضافات میں بھی چھڑیاں اور چھتریوں کی اوٹ میں اپنے پاپوش اور نعلین چھپا دیتے ہیں۔ ان سب احتیاطی تدابیر کے باوجود بعض نمازیوں کو ہر موسم میں مسجد سے اپنے گھر تک کا فاصلہ برہنہ پا ہی طے کرنا پڑتا ہے۔

اب یہاں دو بڑے اہم سوال پیدا ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ اگر نمازی کی توجہ نماز کے دوران اپنے جوتے کی طرف لگی رہے تو وہ نماز کس معیار کی نماز قرار پائے گی؟

دوسری بات یہ کہ عین سجدہ گاہ کے سامنے جوتے رکھنا کہاں تک جائز ہے؟

البتہ یہ مسائل براہ راست فقیہوں سے متعلق ہیں اور اس ضمن میں کوئی اجتہادی قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اس مقام پر قدم کا لفظ میں نے اس لیے استعمال کیا ہے کہ اس کا جوتے سے بہت قریبی تعلق ہے۔ شادی کے موقع پر جوتا چھپانے کی رسم اگر برقرار ہے تو قطعاً کوئی مضائقہ نہیں اس لیے کہ یہ تو ایک ثقافتی مظاہرہ ہے اور ثقافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی۔ البتہ مسجد میں اس مظاہرے کا جاری رہنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔ مزاروں اور زیارت گاہوں پر مدتوں سے اس مسئلے کا حل دریافت کر لیا گیا ہے یعنی بعض لوگ جوتوں کی پاسبانی کا سال بھر ٹھیکہ لے لیتے ہیں اور زائرین کو ٹوکن ایشوع کر کے منافع کے ساتھ اپنی رقم وصول کر لیتے ہیں۔ اس طرح جوتوں کی رکھوالی بھی ہو جاتی ہے اور کمائی بھی۔

مسجد میں یہ صورت بھی ممکن نہیں اس لیے کہ نماز تو سب پر فرض ہے۔ ہمیں یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آ سکی کہ عید کی موقع پر نمازیوں کی تصویر لینے والے فوٹو گرافر کو نماز کیسے معاف ہو گئی۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

جمعہ کے روز ایک جامع مسجد میں خطبہ دیتے ہوئے خطیب محترم مسجد میں جوتوں کی چوری پر اظہار خیال اور اظہار افسوس فرما رہے تھے۔ اس موقع پر تادیر گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے نمازیوں کو جو قیمتی مشورہ دیا وہ یہ تھا۔

"آئندہ سے آپ لوگ مسجد میں ٹوٹے ہوئے اور پھٹے پرانے جوتے پہن کر آیا کریں۔"

خطیب محترم کے اس مشورے کو سن کر ہم آج تک یہی سوچ رہے ہیں کہ پاکیزہ بدن' صاف ستھرے اور معطر لباس کے ساتھ آخر ٹوٹے ہوئے اور پھٹے پرانے جوتوں کا جوڑ کیا ہے؟

ہاتھی کے دانت......

لومڑی اس لیے بدنام ہے کہ بڑی مکار ہوتی ہے۔ ہاتھی اس لیے بڑا ہے کہ بڑا کینہ پرور ہے اور اس کے کھانے کے دانت اور ہیں اور دکھانے کے اور......۔ چونکہ انسان تقویمی سطح پر بہت بلند مرتبے پر فائز ہے اور اگر اس میں ایسی برائیاں پیدا ہو جائیں تو ان جانوروں سے بھی کیا گزرا ہے۔ دوسری طرف اگر ابن آدم اپنے شرف کا پاسبان ہو تو اس کی عظمتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ بگڑے ہوئے اور سنورے ہوئے انسان کتنی مختلف اور متضاد سطحوں پر زندگی بسر کرتے ہیں۔ اسی لیے تو حالی نے کہا تھا۔

جانور آدمی فرشتہ خدا

آدمی کی ہی سینکڑوں قسمیں

جانور اس لیے بدنام ہو گئے کہ اپنی برائیوں پر پردہ ڈالنے کا فن نہیں جانتے لیکن انسان آخر حضرت انسان ہے۔ اپنے عیبوں کو ہنر بنا سکتا ہے۔ نیزے کی انی پر امن کا پرچم لہرا سکتا ہے۔

کاش ایسا ممکن ہوتا کہ خون ٹسٹ کرنے اور ایکسرے لینے سے کسی انسان کی اخلاقی بیماریوں کی تشخیص ہو سکتی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کئی انسان لومڑیوں اور ہاتھیوں کے جرثومے لیے پھرتے ہیں اور سارا معاشرہ ان کی زد میں آیا ہوا ہے۔ لومڑی ذرا سی بھی کیوں نہ ہو فتنہ ہوتی ہے۔ اور ہاتھی ننھا سا بھی ہو تو کافی بڑا ہوتا ہے۔ خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے۔

ظاہر داری اور مکاری جڑواں بہنیں ہیں......۔ بستی بستی ایسے کئی حضرات مل جائیں گے جو بے قفل کی چابیوں کے گچھے لیے پھرتے ہیں اور چکنی چپڑی باتوں کے جال بنتے رہتے ہیں۔ باہر سے ظاہر دار بیگ اور اندر سے لاگ بیگ۔

معاشرے میں ایک فرد کا سب سے بڑا سرمایہ دوسرے فرد پر اعتماد ہے اور تھوڑے سے نفع کی خاطر دوسرے کی آنکھ میں دھول جھونک دینے سے یہ قیمتی خزانہ لٹ جاتا ہے۔ زندگی کے سارے ادارے اعتماد کے سہارے چلتے ہیں۔ ذرا سی مکاری اور ریاکاری اعتماد کو زخمی کر دیتی ہے۔ عدم نے کیا خوب کہا ہے۔

اے عدم ہر گناہ کر لیکن

دوستوں سے ریا کی بات نہ کر

ریاکاری کا لفظ خباثتوں کی ایک پٹاری ہے۔ اس پٹاری میں دکھلاوا بھی ہے' ظاہر پرستی بھی' مکروفریب بھی' زمانہ سازی بھی' پرہیزگاری کا پرچار بھی اور سالوس بھی یعنی کانٹے دار جھاڑیوں کا ایک وسیع ریگستان ہے جس میں کوئی نخلستان نہیں بلکہ سراب ہی سراب ہیں۔ اصل میں یہ پردہ داری کا ایسا مصنوعی حربہ ہے جس سے بے پردہ ہونے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

عموماً دیکھنے میں آیا ہے بعض دولت مند حضرات کسی یتیم خانے یا فلاحی ادارے کی کوئی مدد کرتے ہیں تو اس سلسلے میں پوری تقریب کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مہمان خصوصی کے لیے مسندیں سجائی جاتی ہیں۔ سامعین جمع کیے جاتے ہیں۔ تقریریں کی جاتی ہیں پھر ادارے کے سربراہ کو چیک پیش کیا جاتا ہے اور فیاضی کے اظہار کے اس موقع کے لیے فوٹوگرافر پہلے سے تیار کھڑے ہوتے ہیں پھر اخباروں کے پرچے اس کے چرچے کرتے ہیں اور اس سارے منظر کا پس منظر کسی سینے میں چھپی ہوئی خواہش نمود کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

آپ نے یہ منظر بھی دیکھا ہوگا کہ زبان اور ہونٹوں سے دنیاداری کی ہر بات ہو رہی ہے اور انگلیوں کے درمیان تسبیح پورے تسلسل اور تواتر کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ برزبان تسبیح و در دل گاوخر۔

غور کیا جائے تو اصل مسئلہ دل اور زبان ہی کا ہے۔ اگر دل اور زبان کے سر آپس میں نہ ملتے ہوں تو انسانی وجود ایک بے ڈھنگا نغمہ بن جاتا ہے۔ ان بنیادی سروں کے سنگت ٹوٹ جائے تو اسی کا نام منافقت ہے' اسی سے وہ طرز عمل پیدا ہوتا ہے جو ہاتھی سے منسوب ہے' بلکہ پورے ہاتھی سے نہیں صرف اس کے دانتوں سے۔ اصل نیت کو چھپانے کے لیے بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں' غلاف ہی نہیں بلکہ لحاف اوڑھنے پڑتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ

ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

یہ منافقت ہی تو ہے جو بے شمار اخلاقی بیماریوں کا منبع ہے۔ یہ وہ مرغی ہے جو صرف گندے انڈے دیتی ہے۔ یہ خصلت انسان کے اندر ایسی دورنگی پیدا کر دیتی ہے کہ وہ کسی طرف کا نہیں رہتا۔ ہمارے دور میں اس کی سینکڑوں مضحکہ خیز صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔

''میٹنگ شو'' کے عنوان سے درج ذیل قطعہ اسی کیفیت کا غماز ہے۔

یہ حسن اتفاق نہ ہوتا تو لازماً
مجھ سے کوئی خطا سی خطا ہو گئی تھی آج
انور دعائیں قلم کے وقفے کو دیجیے
ورنہ نماز عصر قضا ہو گئی تھی آج

منافقانہ طرزِ عمل سے انسانی وقتی طور پر تو کچھ فائدہ حاصل کر لیتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی شخصیت کی ساری ساکھ راکھ بن جاتی ہے۔

منافقت دراصل جعلی سکہ چلانے اور جھوٹ کو پاؤں فراہم کرنے کی کوشش ہے ایسا چکر چلانے والے غیر محسوس طور پر خود اس چکر میں پھنس جاتے ہیں۔

قرآن مجید کا ارشاد بھی یہی ہے کہ منافق خود اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ حدیث کی روشنی میں چار باتیں جس شخص میں ہوں گی وہ پورا منافق ہے۔

ا۔ جب اسے امانت دی جائے تو اس میں خیانت کرے

۲۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے

۳۔ وعدہ کرے تو پورا نہ کرے

۴۔ کسی سے جھگڑے تو بدکلامی پر اتر آئے

منافق کی شخصیت اس طرح کھوکھلی ہوتی ہے جیسے خالی ہانڈی پر ڈھکن۔ عرفی شیرازی نے بڑی حکیمانہ باتیں کی ہیں۔ ایک شعر میں وہ کہتا ہے کہ اے دوسروں سے منافقانہ روش اختیار کرنے والے کسی لمحے اپنے ساتھ بھی منافقت کر اور اپنی گھات میں بیٹھ جا تیرے سارے عیب تجھ پر روشن ہو جائیں گے۔

خواہی کہ عیب ہائے تو روشن شود ترا
یکدم منافقانہ نشیں در کمین خویش

◆◆◆

گٹر

فارسی کا ایک محاورہ ہے کہ ''از ماست کہ بر ماست'' اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر جو مصیبت آتی ہے اس کا باعث خود ہمیں ہوتے ہیں۔ لیکن اپنی کوتاہیوں کو تسلیم کرنے کے لیے بڑی ہمت درکار ہے۔ اس شاعر کی حوصلہ مندی کو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے جس نے یہ کھلا اعتراف کیا تھا۔

میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

ہمیں یقیناً ایسی خبریں سن کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ فلاں شخص سڑک پر سے اس بری طرح سے پھسلا کہ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ لیکن یہ افسوس اک واقعہ نتیجہ تو سای بات کا ہے کہ ہم پھلوں کا شوق فرماتے ہیں تو چھلکے بڑی بے نیازی کے ساتھ سڑکوں کی جھولی میں پھینک دیتے ہیں۔ حالانکہ کسی سڑک نے کبھی یہ درخواست نہیں کی کہ

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی

پھل اس لیے کھائے جاتے ہیں کہ صحت کے لیے مفید ہوتے ہیں لیکن ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ صحت کے لیے صفائی بھی بڑی ضروری ہے۔ صفائی نہ ہو تو کھایا پیا کس کام کا؟ صفائی سے بے اعتنائی کے باعث ہماری زندگی کو بڑے اتار اور چڑھاؤ کا سامنا ہے۔ کہیں کثافتوں کے ڈھیر ہیں تو کہیں تعفن سے لبریز گہرائیاں۔ کئی بار یہ منظر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے کہ کوئی صاحب نتھنوں میں رومال ٹھونسے ہوئے کسی علاقے سے گزر رہے ہیں اور اس خیال میں ہیں کہ انہوں نے فضا میں پھیلی ہوئے سڑاند کے خلاف زبردست بغاوت کر رکھی ہے۔ اچانک کوئی کھلا گٹر انہیں اپنی گود میں لے لیتا ہے۔

کیسے بیہودہ ہوتے ہیں یہ گٹر بھی۔ مادے کی ہر صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ کبھی اتنے ٹھوس کہ اپنے ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کبھی گاڑھی سیاہی مائل اگلنا شروع کر دیتے ہیں اور کبھی زہریلی گیس کا گودام بن جاتے ہیں۔ ان گٹروں سے انسانی زندگی کتنی بد مزہ اور تشویشناک ہو کر رہ گئی ہے۔

شہریوں کو ان تعفن بیز اور ہلاکت خیز گڑھوں سے کتنی شکایتیں ہیں۔ لیکن یہ سب یکطرفہ ٹریفک ہے اور انصاف سے بعید۔ گٹروں کے سینوں کے اندر بھی ایک ہیجان برپا ہے۔ وہ بھی کچھ کہنا چاہیں تو ان پر جو گزر رہی وہ بھی سننی چاہیے۔

میں نے ایک غلاظت اگلتے ہوئے منہ پھٹ گٹر کو گھور کر دیکھا تو وہ بول اٹھا۔

''میں اگر اس حالت میں ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں تو اپنے آپ کو ڈھانپے ہوئے تھا۔ شہر بھر کی کثافت کی پردہ پوشی کر رہا تھا۔ میں اپنی کارکردگی سے مطمئن تھا۔ میرا ڈھکنا کافی مضبوط تھا۔ لوہے کا بنا ہوا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ آدھی رات کے قریب جب سڑک بالکل سنسان تھی۔ میں نے کسی کے قدموں کی چاپ سنی۔ کوئی شخص تن تنہا گزر رہا تھا' میرے ڈھکنے کو دیکھتے ہی اس کے دل میں معاً خیال آیا۔۔۔۔۔۔۔مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

اس خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسے ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ وہ کاریگر بار برداری کا اتنا ماہر تھا کہ میرے ڈھکنے کو ایک ہی جھٹکے میں اٹھا کر اندھیرے میں گم ہو گیا۔ میں پکارتا ہی رہ گیا۔ آدھی رات کو میری کون سنتا۔ کوئی چوکیدار بھی میری مدد کو نہیں پہنچا۔ نہیں معلوم میرا وہ آہنی سرپوش کس کباڑیے کی دکان سے ہوتے ہوئے کٹھالی میں پگھل کر رہ گیا ہے۔''

گٹر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''ایک دفعہ پہلے بھی میرے ساتھ ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ محکمے والوں کو شکایت پہنچی تو انہوں نے شکایت دور کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں کی اور چھ ماہ کے اندر اندر میرے سر پر سیمنٹ کی سل لا کر رکھ دی اور یہ سل گاڑیوں کی چند ٹھوکروں اور بارش کے چند تھپیڑوں سے چھلنی ہو کر رہ گئی۔ کاش اس میں سیمنٹ کی اتنی مقدار ہوتی جو اسے کچھ دن سنبھالے رکھتی۔ اس کی ساری ریت اور بجری میرے اوپر آن گری اور پھر مجھ کو ٹھوکریں لگانے والے مدتوں تک مجھ سے ٹکرا کر ٹھوکریں کھاتے رہے' میرے سر پر سریے کی جو مختصر سی جالی سلامت رہ گئی تھی کب تک باقی رہتی۔ اس پر کب تک شبانہ روز ہتھوڑے نہ چلائے گئے۔ دنیا کا سلوک دیکھ کر میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اور پھر کئی سالوں نے اس گنجائش کو غنیمت جانا اور جس کے ہاتھ جتنا کوڑا لگا میرے اندر پھینکتا چلا گیا اور اب میں اتنا بھرا بیٹھا ہوں اور گیس کے باعث اتنا بے چین ہوں کہ ساری گندگی سڑک پر اگلتا جا رہا ہوں۔

گٹر اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا' کہنے لگا۔

''میں اپنے اندر کا لے پانی کو خود کبھی نہیں روکتا۔ مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔ لوگوں نے یہ عادت بھی پال رکھی ہے کہ کپڑوں اور برتنوں کا سارا دھوون جس پائپ میں ڈالتے ہیں اسے بھی سیوریج کے پائپ کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔ حالانکہ محکمہ نے ان پائپوں کو آپس میں جوڑنے سے منع کر رکھا ہے۔ واضح ہدایات کی مسلسل خلاف ورزی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کی ہڈیاں قسما قسم پھلوں کے اور سبزیوں کے چھلکے۔ انت گنت پتے' پیاز کی آلیں' چائے کی پتی اور فالتو اناج کے ڈھیر بھی سیوریج کے پیٹ میں

جھونک دیئے جاتے ہیں حالانکہ کئی مویشی' مرغ مرغیاں اور پرندے ان سے اپنا پیٹ بھر سکتے تھے۔ یہی چیزیں میرے اندر اکٹھی ہو کر پتھر بن جاتی ہیں اور میری ساری کارکردگی جام ہو کر رہ جاتی ہے اور پھر جب تک میں بالکل بند نہیں ہو جاتا اور لوگوں کا ناک میں دم نہیں آ جاتا' میری طرف کوئی توجہ نہیں کرتا۔ پھر محکمہ کو درخواستیں دی جاتی ہیں۔ شکایتیں بھجوائی جاتی ہیں۔ تب کہیں جا کر محکمہ آمادۂ اصلاح ہوتا ہے اور محکمے کے ملازمین خراماں خراماں کدال اور سریے اٹھا کر آتے ہیں اور میری ساری غلاظت نکال کر میرے قرب و جوار میں اس کے انبار لگا دیتے ہیں۔ یہ انبار ٹھوکریں کھاتا ہوا پھر میرے اندر آن گرتا ہے۔ یہ چکر یونہی جاوداں چل رہا ہے۔

گٹر نے مزید یہ انکشاف کیا کہ گھروں کے جو ملحقہ گٹر ہوتے ہیں' صفائی کا عملہ اس لیے انہیں جلدی درست کر دیتا ہے کہ صاحب مکان حسب منشا ان کی مٹھی گرم کر دیتا ہے' لیکن وہ لوگ گٹر کی صفائی کے ساتھ ہاتھ کی صفائی بھی دکھا جاتے ہیں۔ گٹر کے سوراخ کے پاس کوئی اینٹ روڑا اس مہارت سے اٹکا رکھ دیتے ہیں کہ چند دنوں بعد گٹر پھر بند ہو جائے۔

گٹر بولا۔۔۔۔۔۔اب آپ ہی بتایئے' یہاں پر میرا ہمدرد کون ہے۔ باربردار میرا دشمن' ٹھیکیدار میرا دشمن' محکمہ مجھ سے لاپروا اور گاڑیوں اور ٹرکوں والے میرے دشمن۔ دنیا مجھ سے نالاں' میں کثافتوں کا پردہ پوش اور میرے ساتھ یہ سلوک۔۔۔۔۔۔کون میری فریاد کو پہنچے؟

مجھے افسوس ہے کہ مجھے یہ سب کچھ کہنا پڑا۔ کسی کا منہ نہیں کھلوانا چاہیے اور خاص طور پر اس کا منہ تو ہرگز نہیں کھلوانا چاہیے جس پر دوسروں کا باطن ظاہر ہو چکا ہو۔

راز

رازوہ بات ہے جس نے دل سے ہونٹوں تک کا فاصلہ طے نہ کیا ہو۔ابھی اظہار کے زینے پر قدم نہ رکھا ہو اور سینے میں ہی چھپی بیٹھی ہو۔غنچہ ابھی منہ کھول کر شگوفہ نہ بنا ہو تو اس کی خوشبو ایک راز ہے۔ہوا کے سپرد ہو تو اس کا راز کھلے۔عام طور پر لوگ چیزوں کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتے۔عوام کو جو معلوم ہیں وہ سب راز ہیں۔دنیا ذرات کو کب سے جانتی تھی لیکن اب جا کے راز کھلا ہے کہ ہر ذرے میں ایک نظام شمسی چھپا بیٹھا ہے۔لہو خورشید کا نکلے اگر ذرے کا دل چیریں۔۔۔۔۔۔علم دراصل' کائنات کے رازوں کی گرہیں کھولنے کا عمل ہے۔انسان کے پاس جو سب سے بڑی متاع ہے وہ تجسس ہے اور علم اسی تجسس سے پھوٹتا ہے۔

راز کی بات ہو رہی ہے۔راز بہت معمولی سا بھی ہو سکتا ہے اور غیر معمولی بھی۔آرزوؤں اور ارمانوں کی طرح ہر شخص کے دل میں اپنی نوعیت کا راز ہوتا ہے۔شاعر' مفکر' فلسفی اور صوفی صدیوں سے کئی ایک رازوں کی ٹوہ میں لگے ہوئے ہیں۔ان رازوں کی سطح مجازی بھی ہو سکتی ہے اور حقیقی بھی۔شاعروں کے ہاں اس لفظ کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔مجازی سطح دیکھیے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا

دیکھنا یہ ہے کہ کون سا شاعر کون سے راز کی بات کرتا ہے۔یہی شاعر کا اصلی مسئلہ قرار پاتا ہے اور اسی سے اس کی فکری قدوقامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اپنے دل کا راز کسی پر آشکار نہیں کرنا چاہیے۔عمر خیام ایک شاعر ہے اس نے یہ بات زبردست قرینے سے بیان کی ہے۔اس کی بڑی توانا قوت متخیلہ نے دل میں چھپے ہوئے راز کے لیے ایسی تشبیہیں تلاش کی ہیں کہ انسان اس کی فنی گرفت پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔وہ کہتا ہے کہ ایک دانا آدمی کے دل کا راز عنقا (وہ پرندہ جس کا نام تو ہے وجود نہیں) سے بھی زیادہ چھپا ہوا ہونا چاہیے۔اس لیے کہ سیپی میں چھپ کر وہ قطرہ موتی بنتا ہے جو سمندر کے دل کا راز ہوتا ہے۔

آں راز کہ اندر دل دانا باشد

باید که نهفتہ ترز عنقا باشد
کاندر صدف از نہفتگی گردو در
آں قطرہ کہ راز دل دریا باشد

ویسے خیام کے کلام میں جو راز دریافت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہم زندگی کے آغاز اور انجام سے بے خبر ہیں۔ اس پرانی کتاب کا ابتدائی ورق بھی غائب ہے اور آخری ورق بھی۔

ما ز آغاز و ز انجام جہاں بے خبریم
اول و آخر ایں کہن کتاب افتادہ است

یہی اس کا سب سے بڑا راز ہے کہ کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ روشنی کے دونوں طرف تاریکی ہے۔

خواجہ حافظ شیرازی دنیا کے سب سے بڑے غزل گو شمار کیے جاتے ہیں۔ علامہ اقبال بھی ان کے فن بڑے مداح ہیں لیکن ان کے افکار سے متفق نہیں اس لیے کہ حافظ کے ہاں انسانی تجسس کی حوصلہ شکنی کا رویہ بھی موجود ہے۔ حافظ کی شاعری میں زمانہ اور یہ کائنات سب سے بڑے راز ہیں وہ خیام کے ہمنوا بھی ہیں کہ قافلہ چل رہا ہے لیکن منزل کا کچھ پتہ نہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ محفل طرب برپا کرو لمحے لمحے کا رس نچوڑو اور زمانے کا راز تلاش کرنے کی کوشش نہ کرو کہ یہ ایک ایسا معمہ ہے جو نہ پہلے کسی نے حل کیا ہے اور نہ کوئی آئندہ حل کر سکے گا۔ یہاں پر ساری دانائیاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت این معمارا

غالب کے ہاں راز وہ نعرہ ہے جو حسین بن منصور حلاج نے لگایا تھا۔ جب اس نے انا الحق کا نعرہ لگایا تو اس کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا گیا۔ پھر اسے سولی پر چڑھایا گیا۔ پھر اس کی لاش جلائی گئی اور پھر اس کی راکھ بھی دجلہ میں پھینک دی گئی۔ غالب کہتے ہیں کہ جو راز میرے سینے میں ہے وہ کوئی وعظ نہیں ہے وہ منصور کی طرح سولی پر تو کہا جا سکتا ہے منبر پر نہیں کہا جا سکتا۔

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

غالب کے ہاں راز وہی حقیقت ہے جس کا اظہار کر کے حلاج کو مصلوب ہونا پڑا۔ بعض صوفیا نے یہ لکھا ہے کہ منصور کو اسی بات کی سزا دی گئی کہ اس نے سب سے بڑا راز افشا کر دیا۔ حافظ نے یہ بات یوں کہی ہے کہ ہمارے مرشد نے یہ کہا کہ ہمارا وہ یار جس کی وجہ سے سولی کو عظمت عطا ہوئی ہے اس کا جرم یہی تھا کہ راز کی باتوں کو افشا کر دیتا تھا۔

گفت آں یار کزو گشت سر دار بلند
جرمش این بود کہ اسرار ہویدا میکرد

مجازی سطح پر حافظ کا ایک شعر اس مقام پر بہت ہی قابل ذکر ہے۔ حافظ کہتے ہیں کہ محبوب کی صبا نے اور میری آنسوؤں نے غمازی کر ڈالی ہے ورنہ عاشق و معشوق تو راز دار ہوتے ہیں۔

ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق و معشوق راز دارانند

حضرت علامہ اقبال کے ہاں راز جتنی عظمت کا حامل ہے اور کسی شاعر کے ہاں دکھائی نہیں دیتا۔

وہ حرف راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفس جبرئیل دے تو کہوں

اس لیے کہ اقبال کے ہاں راز خود انسان ہے۔ انسان کی جو صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں اور کسی مخلوق کو حاصل نہیں۔ وہ سرتاج تخلیق ہے اور گردوں بھی اس کی قوت تسخیر کی زد میں ہے۔ وہ گردش روزگار سے برسرپیکار ہو کر اسے اپنی مرادوں کے مطابق ڈھالنے کی استعداد بھی رکھتا ہے۔ جہان مجبور میں یہی ہستی مختار تو سب سے بڑا بھید ہے۔

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینہ کائنات میں

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

اقبال نے اسی راز کی گرہیں کھولی ہیں۔ ضمیر زندگی میں غوطہ زن ہو کر انسانی امکانات کا سراغ لگایا ہے' بے شک وہ ایک بے مثال

دانائے راز ہے۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں راز کی سطح مجازی اور مادی بھی رہی ہے اور حقیقی اور عرفانی بھی۔ ہماری جدید اردو شاعری میں یہ دونوں رویے بدستور چلے آ رہے ہیں۔

مصطفی زیدی کے ہاں راز کی سطح ملاحظہ فرمایئے۔ اس میں صرف اسی قدر بلندی ہے کہ اڑتے ہوئے جہاز میں پیش آنے والا تجربہ ہے۔ اس سفر میں ان کی ساری توجہ کا مرکز فضائی میزبان (Air Hostess) ہے۔ وہ اس کی رعنائی اور زیبائی شناسائی کے مرحلے طے کرنے میں مگن ہیں۔

ہم سفر محفلیں آباد کیے بیٹھے ہیں
تو مرا سب سے بڑا راز بنی بیٹھی ہے

ایک جدید شاعر رؤف امیر کا ایک شعر حامل راز ہونے کے باوجود کسی تشریح کا محتاج نہیں۔

تجھ پہ دل کے راز کیسے کھولتے
ہم کہ اپنے آپ سے بھی کم کھلے

بشیر سیفی طنزیہ انداز میں راز اس ابہام کو کہتا ہے جو اس دور میں بعض شاعروں کے ہاں اظہار کمال کے انداز میں پایا جاتا ہے۔

ہر قول اس راز کے اندر سمٹ گیا
معنی سے ایسے رشتہ الفاظ کٹ گیا

اور آج بھی جلیل عالی کے ہاں راز کی وہ بلند ترین سطح موجود ہے جو نا معلوم کو چھو لینے کے لیے بے قرار و سرگرداں ہے۔

آوارگی دل ہے کسی راز کے پیچھے
وحشت لیے پھرتی ہے اک آواز کے پیچھے

◆◆◆

باتیں روزمرہ کی

آپ کی کلائی پر گھڑی بندھی ہو اور دکھائی بھی دے رہی ہو تو پھر آپ جدھر سے بھی گزر جائیں یہ توقع مت رکھئے کہ السلام علیکم کی آواز بھی کہیں کان میں پڑے گی۔ بس ایک ہی جملہ سنائی دے گا کہ بھائی صاحب! ٹائم کیا ہوا ہے؟ اور یہ فریضہ اتنی بار ادا کرنا ہوگا کہ آپ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ کسی اور کام کے لیے نکلے تھے یا اسی خدمت کے لیے خانہ بدر ہوئے تھے۔

رمضان المبارک میں افطاری کے وقت کوئی ٹائم پوچھے تو ایک معقول بات ہوئی لیکن ہر وقت ''وقت'' پوچھنے کا جو عارضہ ہمیں لاحق ہو گیا بہت عجیب سا لگتا ہے۔ بہر حال یہ بھی ایک طے شدہ بات ہے کہ اس دنیا میں کوئی چیز بے سبب نہیں ہوتی البتہ توجیہات اپنی اپنی ہوتی ہیں اس لیے کہ۔۔۔۔۔۔۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست!

اس سلسلے میں ہماری سمجھ میں اتنی بات آئی ہے کہ ہر انسان کے لیے وقت کا فیضان یکساں ہے۔ دن رات کی ایک گردش سب کو پورے چوبیس گھنٹے عطا کرتی ہے کہ لیکن یوں لگتا ہے کہ ہمیں اس عالمگیر قانون سے مستثنیٰ قرار دے کر بہت سا اوور ٹائم بھی دے دیا گیا ہے۔ قدرت نے ہمیں اس دولت سے اتنا مالا مال کر دیا ہے اور ہم اتنے کثیر الاوقات ہو گئے ہیں کہ ہمارے لیے وقت گزارنا مشکل ہے۔

ہماری قدیم و جدید شاعری کے ایک حصے میں اسی خوف کے سائے لہراتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

رات نہ جانے کیسے گزرے
دن تو جوں توں کاٹ لیا ہے

اس لیے کہ ہجر کی رات کے ایک لمحے کے سامنے

زندگی خضر کی چھوٹی سی نظر آتی ہے

وقت کی بہتات کا جو وقت ہم پر پڑا ہے وہ کچھ ہمیں جانتے ہیں لیکن اس عالم میں اتنے بے حوصلہ بھی نہیں ہوئے کہ انگریزی محاورے کے مطابق وقت پر قاتلانہ حملہ کر دیں۔ اس کے برعکس ہم تو انتہائی شائستگی کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ اب اس سے زیادہ قرینے سے وقت کیسے گزارا جا سکتا ہے کہ دو شخص جب آپس میں ملتے ہیں' سلام کہتے ہیں' دو تین مرتبہ بغل گیر ہوتے ہیں۔ پھر ان میں

سے ایک پوچھتا ہے' فرمائیے حال احوال کیسا ہے؟ گھر میں ہر طرح خیریت ہے نا؟ جواباً دوسرے صاحب احوال پرسی کرتے ہیں اور ان کے گھر کی خیریت سے مطلع ہوتے ہیں اور پھر بھی چونکہ وقت کافی ہوتا ہے اس لیے یہ بھی پوچھنا پڑتا ہے اور سنائیے کیا حال ہے؟ اب آداب ملاقات کا فطری تقاضا ہے کہ دوسرے صاحب بھی اپنی خیر و عافیت کا مکرر اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی ضرور کہیں کہ آپ سنائیں اور کیا حال ہے؟

ہمارے ہاں وقت گزاری کا یہ ایک معمولی سا مظاہرہ ہے ورنہ ہم نے تو سر راہے بھی خیریت دریافت کرنے کے ایسے ایسے انداز دیکھے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ احساس ہوا ہے کہ کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ دو ڈھائی گھنٹے گزارنے کیا مشکل ہیں۔ پانچ دس منٹ میں گزر جائیں گے۔

وقت کی فراوانی کے باعث ہمارے یہاں خط لکھتے ہوئے ادھر ادھر کی بے شمار باتیں لکھ چکنے کے بعد صورت احوال آ نکہ کی نوبت آتی ہے۔

ہم نے یہ منظر بارہا دیکھا ہے کہ ایک صاحب کسی دوسرے صاحب کو کوئی واقعہ سنا رہے ہیں اور اس دوران میں کسی غیر اہم سے کردار کا ذکر آ گیا ہے جس سے سامع اگر اپنی ناواقفیت کا اظہار کرے تو واقعہ بیان کرنے والا اصل واقعے کو ایک طرف چھوڑ کر سامع کو اس ضمن اور غیر اہم شخص کے شجرہ نسب' تعلیمی قابلیت' ملازمت اور دیگر کوائف سے پوری ملعومات بہم پہنچا کر دم لیتا ہے اور اس کے بعد اصل واقعہ کے بقیہ بیان کی طرف لوٹتا ہے اور بسا اوقات اصل واقعہ ذہن سے اتر چکا ہوتا ہے۔

گفتگو کی محفلوں میں وقت کو دھکا دینے کے لیے ہم کیسی کیسی علتوں کو رواج دیئے دے رہے ہیں جن میں سرفہرست وہ مشروب ہے جو سردیوں میں گرم رکھتا ہے اور گرمیوں میں ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ ہم نے تہیہ کر رکھا ہے کہ

ہم بھی پئیں' انہیں بھی پلائیں

بسا اوقات ایسی صورت حال بھی ہوتی ہے۔

ابھی	بازار	سے	لاتا	ہوں	چینی
گوالا	گھر	سے	اپنے	چل	پڑا	ہے
حضور	اب	چائے	پی	کر	جائیے	گا
ملازم	لکڑیاں		لینے		گیا	ہے

کھیلوں کی مناسبت سے ہمیں کرکٹ سے بے اندازہ رغبت ہے۔ چونکہ یہ کھیل (خاص طور پر ٹیسٹ میچ) کچھوے کی رفتار سے آگے بڑھتا ہے اس لیے اسے دیکھتا رہنا۔ ہمارے لیے جنت نگاہ اور اس کی کمنٹری سنتے رہنا فردوس گوش ہے۔

جب وقت ہمارے پاس اتنا وافر ہے تو آخر کفران نعمت کیوں کیا جائے اسی لیے ہم کسی کام میں بھی عجلت سے کام نہیں لیتے اور ہمارے سارے کام ہولے ہولے دھیرے دھیرے انجام پاتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے ہر دفتر میں ایک Delaying کلرک تعینات کر رکھا ہے جسے غلطی سے ڈیلنگ کلرک مشہور کر دیا گیا ہے۔ پچھلے دنوں اسی کلرک کی بدولت ہمارے ایک دوست نے اپنے محکمے سے ایک مہینے کی چھٹی لینی چاہی تو اس تگ و دو میں اس کے دو مہینے لگ گئے۔

غالب نے اپنے ایک فارسی شعر میں یہ مضمون باندھا ہے کہ میں نے خوش نصیبی کے پرندے ہما کو شکار کرنے کے لیے دانہ ڈالا اور دم بچھایا اور انتظار میں بیٹھ گیا۔ اسی انتظار میں دانہ پھوٹ پڑا اور بڑھتے بڑھتے درخت بن گیا اور اس پر پرندوں نے آشیانے بنا لیے لیکن میرا جال ابھی تک ہما کا منتظر ہے۔

دمید دانہ و بالید و آشیاں گہ شد
در انتظار ہما دام چیدنم بنگر

بالکل یہی حال ہمارے یہاں ان لوگوں کا ہے جو وقت گزاری کے لیے مختلف محکموں میں درخواستیں گزار دیتے ہیں اور پھر بڑے صاحب کے دفتر میں باہر بنچوں پر انتظار کھینچتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے دور دراز کا سفر طے کر کے آتے ہیں اور ہر روز ان دو جملوں میں سے کوئی ایک جملہ "صاحب میٹنگ میں ہیں" اور "صاحب دورے پر گئے ہیں" سنتے ہیں اور پھر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

رائی کا پربت...... پربت کا رائی

مشہور محاورہ ہے "رائی کا پربت بنانا" اسی چیز کو موجودہ دور میں عکاسی کی اصطلاح میں Enlargement کہتے ہیں یعنی کوڈو کا عالم چنا بنا دینا۔ کارٹون کی تکنیک بھی یہی ہے۔ کسی عیب کی نشاندہی مقصود ہو تو اسے اتنا نمایاں کر دینا کہ اس کے علاوہ ہر دوسری چیز کا وجود عدم ہو کر رہ جائے۔

ایک عرب شاعر کے ایک دوست کے چہرے پر سب سے زیادہ جگہ گھیرنے والی چیز اس کی ناک تھی' اس لیے جب بھی وہ دوست اسے ملتا تو وہ اسے کہتا "اسلام علیکما" (تم دونوں پر سلام ہو) یعنی وہ اس کی ناک کو ایک الگ وجود تصور کرتا تھا۔ اسی طرح ایک صاحب کی ٹانگیں خاصی لمبی تھیں اور اس کے دوست ازراہ مذاق اس سے کہا کرتے تھے کہ سردیوں میں آپ کی ٹانگیں اتنی دراز ہیں تو گرمیوں میں ان کا کیا عالم ہوتا ہوگا۔ اس مذاق میں یہ سائنسی نکتہ پوشیدہ ہے کہ چیزیں حرارت سے پھیلتی ہیں۔ اس تمام خوش مذاقی میں مبالغہ اور انلارجمنٹ کا اصول ہی کارفرما ہے۔ گفتگو میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے اس اصول کا استعمال شروع سے چلا آ رہا ہے۔

چیزوں کو پھیلا کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کے ساتھ ہی ساتھ عمل تصغیر یعنی Minimise کرنے کا عمل بھی جاری وساری ہے۔

قطرے کو دریا' دریا کو قطرہ' نقطے کو دائرہ' دائرے کو نقطہ' جزو کل کو کل اور کل کو جزو ظاہر کرنا آدمی کا معمول ہے۔

اس لیے کہ اس عمل سے انسان کے بعض جذبے تسکین پاتے ہیں۔ اپنی بلی کو شیرنی اور دوسرے کی شیرنی کو بلی ظاہر کرنے کے پیچھے جو تسلیاں ہوتی ہیں ان کی تفصیل ماہرین نفسیات ہی بتا سکتے ہیں۔ کسی شاعر نے اپنی پریشانیوں کی کیسی عمدہ Summary بنائی ہے کہ

بے چینیاں سمیٹ کے سارے جہاں کی
جب کچھ نہ بن سکا تو مرا دل بنا دیا

اسی طرح ایک اور شاعر نے ایک ہی مصرع میں اپنی داستان محبت کے اختصار اور تفصیل کو اس طرح بیان کر دیا ہے کہ "سمٹے تو دل عاشق پھیلے تو زمانہ ہے"

مشاہدہ اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ کائنات میں اس پھیلاؤ اور سمٹاؤ کی کروڑوں صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ایٹم کا ایک ننھا سا آفتاب ہے۔ اور آفتاب ایک بہت بڑا ایٹم۔ اقبال نے شمع سے مخاطب ہو کر پروانے کے بارے میں ایسی ہی بات کی ہے۔

چھوٹا سا طور تو یہ ذرا سا کلیم ہے

سمٹاؤ اور پھیلاؤ کی یہ صورتیں مکانی ہی نہیں زمانی بھی ہوتی ہیں۔ باطنی کیفیات زمانے کو سمٹاتی اور پھیلاتی رہتی ہیں۔

ایک پل بھی وہ ملے تو میں بتاؤں اس کو
ایک پل میں بھی گزرتے ہیں زمانے کتنے
شب ہجر کے تجربے نے بتایا
بڑی عمر دی عاشقوں کو خدا نے

فردوسی نے قبل اسلام کے ایرانی بادشاہوں کی تاریخ کو ساٹھ ہزار اشعار میں پھیلا دیا ہے اور اقبال نے پوری تاریخ انسانی کو ایک مصرعے کے کیپسول میں بند کر دیا ہے۔

تراشیدم٬ پرستیدم٬ شکستم

یعنی میں نے بت تراشے٬ پوجے اور توڑ ڈالے۔۔۔۔۔۔یہی میری سرگزشت ہے۔

اس کرۂ ارض پر ابھی تک صرف پانچ ہزار سال پہلے کی انسانی تاریخ معلوم ہو سکی ہے اس کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا ہے جو لاکھوں سالوں تک پھیلا ہوا ہے۔ مشہور مورخ فلپ ہٹی نے ایک مقام پر تاریخ کا بڑا دلچسپ خلاصہ پیش کیا ہے کہ اگر زمین کی عمر کو ایک سال کی مدت فرض کر لیا جائے تو یوں سمجھے کہ پہلے آٹھ مہینے یعنی جنوری سے اگست تک کا زمانہ زندگی کے آثار سے بالکل خالی تھا۔ دودھ دینے والے جانور دسمبر کے دوسرے ہفتے میں پیدا ہوئے اور انسانی زندگی کا آغاز ۳۱ دسمبر کو دوپہر کے گیارہ بج کر پینتالیس منٹ پر ہوا تھا۔ صرف ایک منٹ گزرا ہے کہ انسان نے لکھنا پڑھنا سیکھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بیس سیکنڈ پہلے دنیا میں تشریف لائے اور امریکہ کی دریافت کو صرف چھ سیکنڈ کا عرصہ گزرا ہے۔ زمانے کی اس تصغیر سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان ابھی اپنے بچپنے کی منزل میں ہے۔ ابھی ابھی اس نے چلنا سیکھا ہے اور تھوڑی دیر گزری ہے کہ اس نے اپنا لڑکھڑاتا ہوا پاؤں چاند پر رکھا ہے۔

دیکھا آپ نے انسان کو رائی کا پربت اور پربت کی رائی بنانے میں کیسا ید طولیٰ حاصل ہے۔

◆◆◆